مئی 61

مئی 61

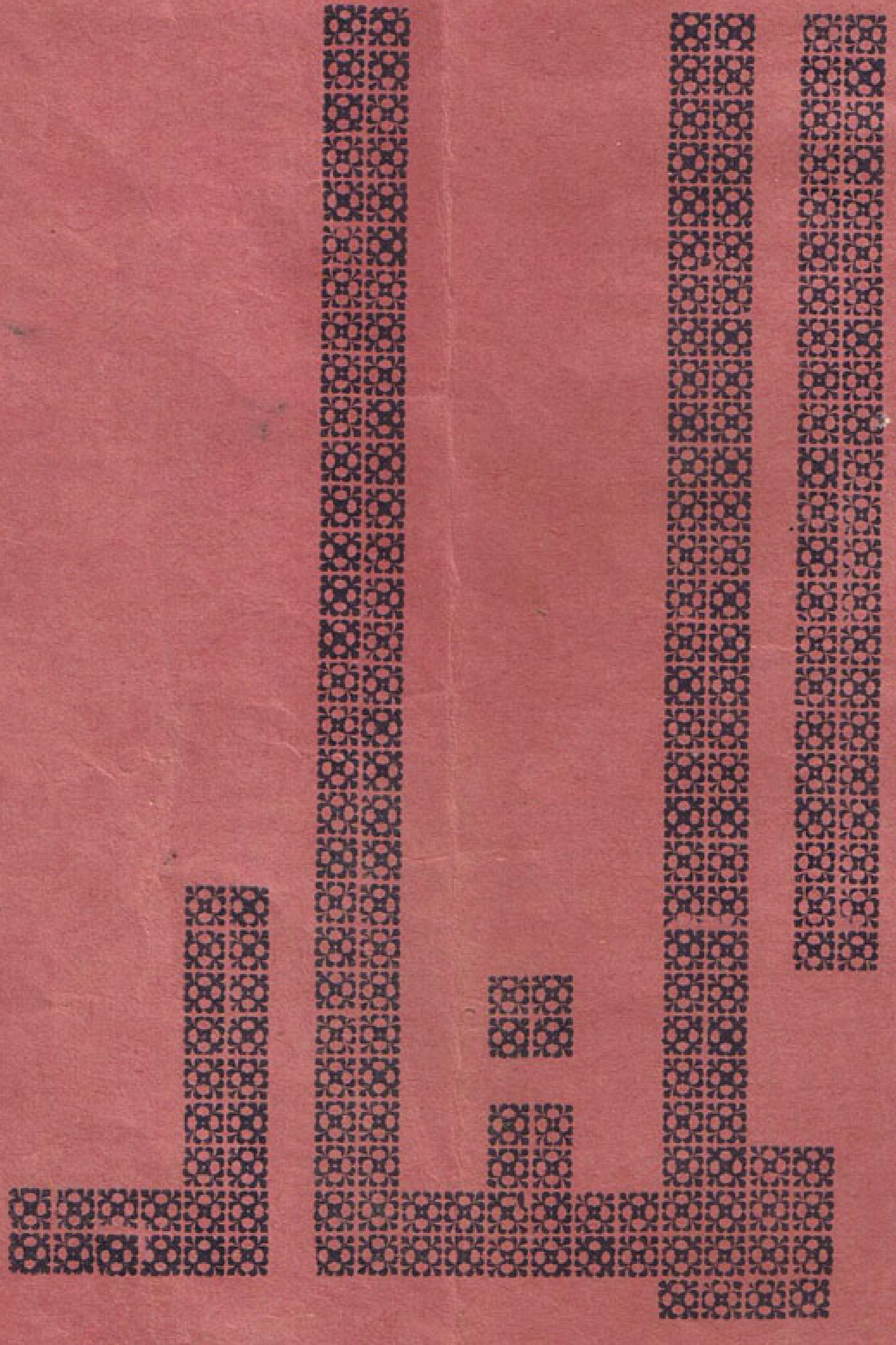

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ

(قرآن کریم ۔ سورۃ اعراف)

المنار

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

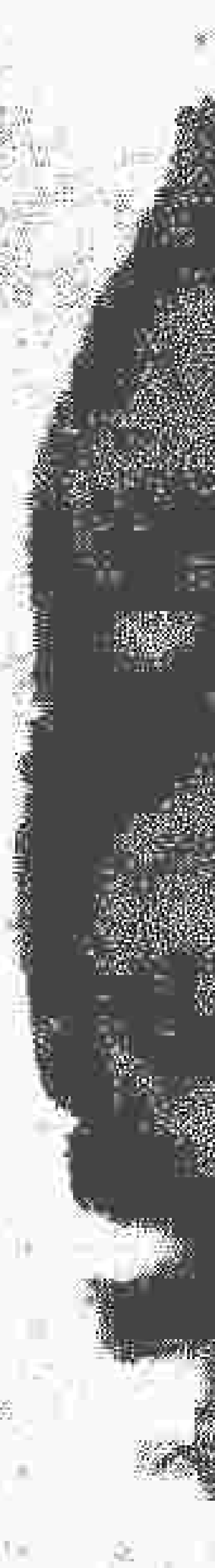

نگران: محمد شریف خالد ایم اے ایل ایل بی

مدیر: ارشد ترمذی

جلد ۱۲ مئی سنہ ۱۹۶۱ء شمارہ ۱

پرنٹر و پبلشر:۔ اے ۔ آر جمید ہاشمی ۔۔۔ مطبع ضیاء الاسلام ۔ ربوہ

صرف ٹائیٹل نصرت آرٹ پریس ربوہ میں چھپا

ترتیب

۱- اداریہ	ایڈیٹر	۳
۲- غزل	سید سعادت علی (احمد آباد والے)	۴
۳- مشاہدات	زرتشت منیر - ارشد ترمذی - محمد صدیق	۵
۴- قطار بندی	زرتشت منیر احمد خاں	۶
۵ قدم قدم پہ ۔۔۔ (افسانہ)	کلیم اللہ خاں	۷
۶- ربوہ کے متعلق میرے تاثرات	مختار احمد	۸
۷- کالج کے قیام کی غرض و غایت	سیدنا حضرت امیرالمومنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز	۹
۸- کلام امام	〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃	۲۴
۹- ایڈیٹر کے نام	پروفیسر بشارت الرحمٰن ایم۔ اے۔ ڈاکٹر کیپٹن محمد رمضان غلام رسول آشنا۔	۲۵
〃 〃 〃		
۱۰- اور وہ رخصت ہو گیا	ملک منصور احمد عمر	۲۹
۱۱- پارہ ہائے دانش	محمد جمیل لطیف	۳۱
۱۲- زکام	منیر احمد فرخ	۳۲
۱۳- مباحثہ کی روح	رشید احمد جاوید	۳۴
۱۴- غزل	شیخ روشن دین تنویر	۴۱
۱۵- کوئل سے	پروفیسر محمد شریف خالد	۴۲
۱۶- غزل	قاضی محمد ظہور الدین اکمل	۴۳
۱۷- غزل	پروفیسر نصیر احمد خان	۴۴
۱۸- تسمیہ پارسی	ارشد ترمذی	۴۵
۱۹- دو غزلیں	نصیر علی آبر - حکیم محمد صدیق	۴۶
۲۰- دو غزلیں	خلیل راسوری - لطف الرحمٰن محمود	۴۷
۲۱- غزل	مصلح الدین احمد راجیکی مرحوم	۴۸

اداریہ

محنت، دیانت داری اور دعا

فضل عمر ہوسٹل کی الوداعی تقریب کے موقعہ پر حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب ایم۔ اے مدظلہ اللہ تعالیٰ نے اپنے صدارتی ارشادات میں طلباء کو جو نصائح فرمائیں ان میں آپ نے تین باتوں (۱) محنت (۲) دیانت داری اور دعا کے متعلق خاص طور پر تاکید فرمائی کہ محنت انسان کی دولت، دیانتداری اس کا زیور اور دعا اس کا سہارا ہے۔ انسانی زندگی کے یہی تین بڑے ستون ہیں۔ چوتھا ستون یقین اور ایمان کامل ہے۔ تعلیم الاسلام کالج کے قیام کی غرض وغایت ہی یہ ہے کہ یہاں سے پڑھے ہوئے طلباء نہ صرف بہترین شہری ہی بنیں۔ بلکہ وہ اعلیٰ درجہ کے مسلمان بھی ثابت ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی لازمی ہے۔ انسانی زندگی کے اعلیٰ اور ارفع مقصد کے متلاشیوں کے لئے حضرت صاحبزادہ صاحب کی یہ نصائح مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

آپ فرماتے ہیں:۔

"محنت انسان کی ترقی میں دماغی قوتوں کی نسبت زیادہ اثر رکھتی ہے۔ اور دیانتداری اخلاق کا بہترین پہلو ہے اور دراصل یہی وہ چیز ہے جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے۔ آپ لوگوں کو ان دونوں صفات میں کمال پیدا کرنا چاہئے۔ دعا اپنے خالق سے ذاتی رابطہ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ جو شخص خدا تعالیٰ سے غافل ہے وہ دراصل اپنی ہستی سے غافل ہے۔ محض اسلام اور احمدیت کا دعویٰ کوئی چیز نہیں۔ اصل چیز عمل ہے۔ جب تک انسان کے قول اور فعل میں مطابقت نہ ہو وہ خدائی نصرت سے محروم رہتا ہے۔"

حضرت صاحبزادہ صاحب نے بی اے اور ایف اے کے طلباء کو نصیحت کی۔ کہ

"آپ لوگوں کا امتحان قریب ہے۔ آپ کو چاہئے کہ امتحان خوب توجہ اور محنت سے دیں۔ محنت اور توجہ کا معیار یہ نہ ہو کہ صرف پاس ہونا ہے بلکہ یہ ہو کہ اعلیٰ نمبروں پر پاس ہونا ہے۔ اور اس کے بغیر ترقی اور امتیاز محال ہے۔"

الوداع

ادارہ المنار اپنے ان تمام دوستوں۔ کرم فرماؤں اور ساتھیوں کو دلی دعاؤں کے ساتھ الوداع کہتا ہے۔ جو کالج کی تعلیم مکمل کر کے ہم سے رخصت ہو رہے ہیں۔ ہماری دلی تمنا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں پے درپے کامیابیوں اور کامرانیوں سے نوازے۔ آمین۔

ان رخصت ہونے والے ساتھیوں میں سے ہم بعض کا دلی شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان میں سے ایک تو کلیم اللہ خان ہیں۔ جو پچھلے دو سال سے کشتئ المنار کے ناخدا

رہے۔ آپ یقیناً ادارہ کے دلی شکریہ کے مستحق ہیں ان کے ساتھ مرزا محمد الیاس کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا جو کہ اس عرصہ میں مدیر معاون رہے ہیں۔

ان کے علاوہ ہم ان احباب کے بھی شکر گزار ہیں۔ جن کی بلند پایہ نگارشات المنار کی زینت بنتی رہیں۔

اپیل

المنار طلباء کا اپنا رسالہ ہے۔ جو کہ انہی کی نگارشات کی اشاعت کے لئے مخصوص ہے۔ آپ حضرات سے اپیل ہے۔ کہ ہم سے تعاون کرتے ہوئے اپنی نگارشات سے بزم المنار کو رونق بخشیں۔ اور اپنی بے لاگ آراء اور قیمتی مشوروں سے ہماری راہنمائی فرمائیں۔

سالنامہ

ان دنوں امتحانات کی وجہ سے سارے کا سارا کالج ایک امتحانی ماحول کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ بی اے اور ایف۔ اے کے طلباء قلموں اور دواتوں سے مسلح ہو کر رزمگاہ امتحان میں برسر پیکار ہیں۔ فرسٹ ایر والے ابھی امتحانی خوف کے کھنڈروں کو اپنے اذہان سے اتار رہے ہیں۔ اور تھرڈ ایر کے طلباء عنقریب اس سے دوچار ہونے والے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم المنار کا سالنامہ ستمبر تک ملتوی کر رہے ہیں۔

* * *

(بقیہ صـ) میاں کچھ ہوش کے ناخن لو۔ چائے کے کاکوں کو گرم پانی اس لئے مہیا کیا جاتا ہے۔ تاکہ ان کی جسمانی صحت کو کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ نہ رہے۔ اور مالک ٹھنڈے پانی سے محروم ہی رہے۔

بعد میں باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا کہ کنگ شاپ میں گرم پانی ہر وقت اس لئے تیار رکھا جاتا ہے تاکہ چائے بنانے میں زیادہ زحمت نہ اٹھانی پڑے۔

مکرم سید سجاد علی صاحب لیکچرر
اولڈ سٹوڈنٹ ٹی۔ آئی کالج

○

پریت کی نگری سونی سونی
آس کے دیپک مدھم مدھم

پنچھی آج بے وقت پکارے
کون سنے گا اُن کا ماتم

پت جھڑ نے سب پنکھ بکھیرے
کلی کلی کی آنکھیں پُرنم

پریم کی واسی سوگ رچاتے
چھائی اداسی پُورب پچھم

اس دنیا کی ریت یہی ہے
آسی روئیں بچھڑیں پیتم

مشاہدات

یتیم بوڑھا

انارکلی میں ایک ساٹھ ستر سال کا بوڑھا بھیک مانگتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی گردن میں ایک تختہ لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ جس پر تحریر ہے:۔

"میں ایک بوڑھا غریب یتیم آدمی ہوں"

اور نیچے انگریزی خواں احباب کے لئے انگریزی ترجمہ تحریر ہے

"I am an old man

اونگھ

ایک دفعہ کیمبرج یونیورسٹی کے ایک سکالر یہاں آئے وہ انگریزی میں تقریر کرتے ہوئے بعض مسائل اور سوالات دریافت فرماتے رہے۔ غالباً صاحب صدر تقریر کے دوران میں اونگھتے رہے۔ کیونکہ اختتام پر انہوں نے اعلان کیا۔ کہ

"جو احباب فاضل مقرر سے سوالات پوچھنا چاہیں۔ وہ پوچھ سکتے ہیں"

خودکشی

ایک طیارے میں مختلف قومیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد سفر کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کھلاڑی بھی تھا۔ اس کے توسط سے کھیلوں کی باتیں ہونے لگیں۔ ہر ایک سے اپنی اپنی قومی کھیلوں کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ تو امریکی نے کہا۔ ہمارا قومی کھیل باسکٹ بال ہے انگریز نے فٹ بال اور کرکٹ کے نام بتائے۔ جس کے مقابلے میں پاکستانی نے کرکٹ اور ہاکی کے نام گنوا دیئے۔ اس طرح سب نے کسی نہ کسی کھیل کا نام بتایا۔ سب سے آخر میں ایک جاپانی بیٹھا تھا سب مسافروں کا خیال تھا۔ کہ وہ قد کی مناسبت سے ٹیبل ٹینس کا نام لے گا۔ لیکن نہیں جب اس کو پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا

"میری قوم کا پسندیدہ کھیل خودکشی ہے"

چالان

ایک صاحب سمندر کے کنارے تفریح کی غرض سے کار چلا رہے تھے۔ اچانک انہوں نے ایک شخص کو سمندر میں ڈوبتے ہوئے پایا۔ چنانچہ انہوں نے فوراً بریکیں لگا کر سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ ڈوبنے والے کو بچا کر کنارے پر لانے کے بعد جب وہ اپنی کار کی طرف گئے۔ تو انہوں نے کار کے پاس قانون کے ایک محافظ کو کھڑے پایا۔ کیونکہ کار غلط جگہ پارک کرنے کے الزام میں ان کا چالان ہو چکا تھا۔

(زرتشت منیر احمد)

احساس

جنوری کی ایک خنک صبح کو ہم لاہور کے سب سے بارونق بازار انارکلی میں سے گزر رہے تھے۔ ہمارے ساتھ کالج کے چند اور طلباء بھی تھے۔ جو بورڈ کی کشتی رانی کا مقابلہ دیکھنے لاہور گئے ہوئے تھے۔ بازار حسب معمول بھرا ہوا تھا۔ اور شانے سے شانہ چھل رہا تھا۔ طلباء کی نگاہیں نئے نئے فیشن ایبل سوٹوں پر جمی ہوئی تھیں۔ فرخ صاحب اپنا اوور کوٹ ساتھ نہ لانے پر پشیمان تھے۔ اور آشنا صاحب

اپنا مقلد (Old fashioned) ہونے کی وجہ سے دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے۔ اس رنگین ماحول میں میری نگاہیں گردش کرتی ہوئیں ”بنٹی کلاتھ ہاؤس“ کے سامنے جاتے ہوئے ایک پچاس سالہ آدمی پر جم گئیں۔ جو اپنی ہی عمر کا ایک لحاف جو اسی کی طرح اپنے خد و خال اور رنگ روپ کھو چکا تھا۔ اوڑھے، زرق برق لباسوں سے بھرپور ماحول کا منہ چڑاتے ہوئے بڑی شان سے چل رہا تھا

(ارشد ترمذی)

پاکستانی صنعت کار

ایک دفعہ میں بازار میں کپڑا خریدنے گیا۔ غلام رسول بزاز کی دکان پر جا کر بیٹھ گیا۔ اور ولایتی کپڑا دکھانے کے لئے کہا۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا: ”بھائی صاحب! پاکستان کو آزاد ہوئے قریباً تیرہ سال ہو گئے ہیں۔ لیکن غیر ملکی اثر ابھی تک ہمارے دماغوں پر باقی ہے۔ آپ ولایتی کپڑے کی بجائے پاکستان کا بنا ہوا کپڑا خرید کر اپنے ملک کے صنعت کاروں کی حوصلہ افزائی کریں“

اس کے ان الفاظ نے میرے دل پر گہرا اثر کیا اور میں نے دل میں پختہ ارادہ کر لیا کہ آئندہ کبھی کسی غیر ملکی چیز کا نام تک نہ لوں گا۔

چنانچہ میں نے تیس روپے کا پاکستانی کپڑا خرید لیا لیکن بل ادا کرنے کے لئے جیب کی طرف ہاتھ کیا تو حیران ہو گیا۔ کہ نہ جیب تھی۔ اور نہ بل ادا کرنے کے لئے پیسے۔ اسی وقت میری زبان سے یہ الفاظ بے ساختہ نکل گئے۔

”بھائی جان میں پاکستانی صنعت کاروں
کا بڑا شکر گذار ہوں۔ کہ اگرچہ وہ جیب کے
ہتھیار مثلاً چاقو، چھری اور قینچی وغیرہ کو
اچھی طرح بنا نہیں سکتے تو ان کا استعمال
بہت اچھا جانتے ہیں۔“ (محمد رفیق فرسٹ ایئر)

وفا کنیم و ملامت کشیم و خوش باشیم
کہ در طریقت ما کافری است رنجیدن

[illegible] منیر احمد خان

قطار بندی

ہمیں زندگی کے ہر میدان میں قطار بندی کا نظام نظر آتا ہے۔ یہ نظام بہت سے فوائد کا حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسٹیشن پر، ڈاک خانہ میں، بینکوں میں اور کالج کے اخراجات (Dues) ادا کرتے وقت کیشیر کی کھڑکی کے سامنے یہی نظام ہماری رہبری دکھائی دیتا ہے۔ انسانی زندگی بھی قطار بندی کے نظام سے مستثنیٰ نہیں۔ یہاں دادا، باپ، بیٹا باری باری آتے اور چلے جاتے ہیں۔

ہماری آفس کے سامنے پانی کے دو مٹکے پڑے رہتے ہیں۔ یوں تو مٹکے دو ہیں لیکن گلاس ایک ہی ہے۔ اس وجہ سے قطار بھی صرف ایک بنتی ہے جو کافی لمبی ہو جاتی ہے۔ پسینے میں شرابور ہانپتے کانپتے جناب مالک آئے وہ چونکہ قوم کے بڑے ہمدرد ہیں اور قوم کی ترقی کی خاطر اصولوں کی بہت پابندی کرتے ہیں اس لئے وہ قطار میں کھڑے ہو گئے اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔ صرف چار عدد پیریڈز کی قربانی کرنے کے بعد جب مالک کی باری آئی۔ تو مٹکے میں آخری بوند بھی بخارات میں تبدیل ہو کر فضا میں تحلیل ہو چکی تھی۔ میرے مخلصانہ مشورہ کو قبول کرتے ہوئے وہ اس کے ساتھ کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ سے گیسوں کی ناگوار بو کا سامنا کرتے ہوئے پانی کی تلاش میں ٹک شاپ پر پہنچے۔ میں نے پانی اور چائے کا آرڈر دیا۔ آنکھ جھپکتے ہی پانی کے دو گلاس ہماری میز پر موجود تھے۔ پانی کے لبوں سے مس ہوتے ہی ”ماءِ حمیم“ کا احساس ہوا۔ میرا اور میرے ساتھی کا رواں رواں کانپ اٹھا۔ گستاخی کی معافی مانگتے ہوئے اور لاحول کا ورد کرتے ہوئے ڈرتے ڈرتے داروغہ جی سے اس کی وجہ دریافت کی گئی۔ جواب ملا ”دہائی صیب

ایک حقیقت، ایک افسانہ

کلیم اللہ خان

"قدم قدم پہ قیامت اٹھائی جاتی ہے!"

ابھی بس سے اُترا ہی تھا۔ کہ کئی پٹھان چھوکروں نے آن گھیرا اور سامان کے متعلق دریافت کر کے اس کی طرف بڑھے ۔۔۔ میں چاروں طرف دیکھ ہی رہا تھا۔ کہ ایک جھگڑا کھڑا ہوا ۔۔۔ تو۔ تو میں میں ہونے لگی۔ ایک کہنے لگا۔ بستر میں اٹھاؤں گا۔ دوسرا کہنے لگا میں ۔۔۔ بستر کیا تھا۔ ایک طرف ان لڑکوں کے بوجھ سے بس کی چھت دب گئی تو دوسری طرف ان کی ہاتھا پائی سے بس کی گاڑی لگ گئی ۔۔۔ ایک دوسرے کو خوب نوچنے اور گھونسے رسید کئے گئے ۔۔۔ میں نے چیخ چیخ کر کہا۔ بس بھئی بس رہنے دو اور جھگڑا بس کرو ۔۔۔ اس پر ایک نے جواب دیا بس ابھی نہیں چلے گی۔ اور یہ کہہ کر تین چار لڑکوں نے ہاتھ ڈال کر میرے بستر کی لاش کو زمین پر دے مارا ۔۔۔ اور پیچھے آ کر سب نے ہی پیسوں کا مطالبہ کیا۔ میں شش و پنج میں پڑ گیا اُن کی حالت بھی ایسی دکھائی پڑی کہ نہ ان کے گھر آگ ہے نہ گھڑے پانی ۔۔۔ آخر ان کا برا حال دیکھ کر چار چار آنے دے کر رخصت کیا ۔۔۔ اس دن جب اتفاقات رونما ہونے لگے آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا ۔۔۔ ابھی ان سے پیچھا چھڑا پایا ہی تھا کہ چند تانگے والوں نے آ لیا۔ اور لگے سامان اٹھانے اور کہنے لگے۔ بابو صاحب! "آئی ایس بی" جائے گا؟ میں نے بڑے اطمینان سے کہا نہیں ۔۔۔ پھر کہنے لگے افسر نہیں بنے گا؟ میں نے کہا نہیں ۔۔۔ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد کہنے لگے "پی اے ایف" جائے گا؟ میں نے پھر نفی میں جواب دیا۔ اس پر جھنجھلا کر کہنے لگے پھر کیوں جانے کے لئے آیا ہے؟ ان کے سوالات کی بوچھاڑ جاری ہی رہی ۔۔۔ میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اور میں خوشی سے کُپا ہو گیا تھا۔ کہ ایک سال کے بعد پھر میں P.M.A کے تمام مراحل طے کر کے آخری انٹرویو ISSB کوہاٹ پہنچ گیا ہوں۔ اور انشاءاللہ واپس افسر بن کر جاؤں گا ۔۔۔ غرض کئی خیالات ابھرنے اور ڈوبنے لگے ۔۔۔ تانگے والوں نے ناک میں دم کئے رکھا۔ آخر اُن کو "ہاں" کہہ کر ہی بن پڑی۔ اور چین پڑا۔ آنکھ جھپکنے ہی کی دیر تھی کہ کھٹ پٹ ختم ہوئی۔ اور جھٹ پٹ ایک نے سامان اٹھا کر اپنے تانگے میں رکھ لیا۔ میں تانگے میں سوار ہوا۔ اور چونکہ میں اپنے دوست کے رشتہ دار کے ہاں شام تک ٹھہرنا چاہتا تھا۔ میں نے تانگے والے کو ان ڈاکٹر صاحب کا نام وغیرہ بتایا ۔۔۔ جو اپنے اندازے کے مطابق نہ جانے کہاں کہاں گھماتا رہا ۔۔۔ ہسپتال اور P.A.F. MESS اور ملحقہ کوٹھیوں کا کئی بار طواف کیا ۔۔۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے دو گھنٹے گزر گئے۔ حالت ڈانواں ڈول تھی ۔۔۔ بہتیرے کنویں میں بانس ڈلوائے۔ آنے کا منہ دیکھتا اور جاتے کی پیٹھ۔ آخر یونہی ٹوٹ کر بیٹھ رہنے کی ٹھانی ۔۔۔ پھر سوچنے لگا۔ خدا خدا کر کے ایک کلب کے بیرہ دوست نے بتایا کہ وہ غالباً I.S.S.B کے قریب ہی رہتے ہیں ۔۔۔ اس پر کچھ ڈھارس بندھی اور کچھ نکلتا نظر آیا اور فوراً ادھر کا رخ کیا۔ تانگہ فینسی روڈ سے گزر رہا تھا کہ ایک کوٹھی کے چوکیدار نے روکا اور کہنے لگا بابو صاحب! آپ ڈاکٹر صاحب کے مہمان ہیں؟ میں نے کہا ہاں ۔۔۔ اور ان کا نام لیا ۔۔۔ میں ہکا بکا تھا۔ کہ اس کو کس طرح پتہ لگ گیا اور کس طرح پہچان لیا۔ چنانچہ اس سے دریافت کیا (بقیہ صفحہ

مختار احمد

ربوہ کے متعلق میرے تاثرات

فطرتی طور پر ہر نیا ماحول اور ہر نئی فضا آنے والے کے ذہن پر چند نقوش اور تاثرات چھوڑتی ہے۔ میں ربوہ میں نئے آنے والوں میں سے ایک ہوں۔

پچھلے سال جب میں نے ربوہ کی خشک وادی میں قدم رکھا۔ تو جھٹ میرے ذہن میں حاکم بن جبلہ کی وہ رپورٹ آگئی۔ جو اس نے سندھ کے متعلق لکھی تھی اس نے لکھا تھا۔ پانی گدلا ہے اور پھل کم ہیں اگر تھوڑی فوج بھیجی گئی۔ تو دشمن کے ہاتھوں تباہ ہو جائے گی۔ اگر زیادہ فوج بھیجی گئی۔ تو بھوک اور پیاس سے مر جائے گی حقیقت بھی یہی ہے۔ کہ ربوہ کے حالات بھی اسی قسم کے تھے۔ اور یہ یہاں کے رہنے والوں کی جد و جہد ہے کہ انہوں نے جنگل میں منگل بنا دیا۔ چنانچہ چند ماہ کے جائزہ کے بعد میں نے محسوس کیا۔ کہ فی الواقعہ یہ وادیٔ نمل ہے جس کا سپہ سالار سلیمان اعظم ہے۔

شروع شروع ایام میں میں گھنٹوں سوچتا۔ کہ ان لوگوں کے ذرائع آمدنی کیا ہیں۔ یہ لوگ یہاں کس طرح زندگی بسر کر رہے ہیں؟ ساتھ ہی یہ خیال بھی ذہنی سطح پر ابھرتا کہ اگر باوجود ناسازگار حالات کے یہ لوگ خوشحال ہیں۔ تو اس کی وجہ کیا ہے؟ ان سب سوالات کا جواب مجھے جلسہ سالانہ کی مبارک تقریب پر مل گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ میرا ایک عجیب خیال مجھے عرب کے رہنے والوں اور مکہ کے ابتدائی ماحول میں لے گیا۔

آج سے اس پندرہ سال پہلے کا تصور ذہن میں لایا جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ وادی جنگلی جانوروں کی آماجگاہ ہوگی۔ ڈاکوؤں اور چوروں کی سرزمین ہوگی اور مسافر بھی یہاں سے پہلو بچا کر گذر جاتا ہوگا۔ تو ایسے حالات میں اس قطعہ زمین کو کیسے آباد کیا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب میرے ذہن میں ابھرا اور میں نے تاریخ کے سنہری صفحات میں مجھے طارق کا قصہ یاد آیا۔ جب کہ اس نے تیونس کے ریگزاروں میں باآواز بلند کہا تھا:

"اے جنگلی جانورو ہم رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی خلافت کے قیام کی غرض سے یہاں آئے ہیں۔ ہم نے اس سرزمین پر عظمت اسلام کے جھنڈے لہرانا ہے۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس قطعہ زمین کو خالی کر دو۔"

تاریخ شاہد ہے کہ جنگلی جانوروں نے اس علاقہ کو چھوڑ دیا۔ یہی تصور ربوہ کی آبادی کے سلسلہ میں مذکورہ سوال کا جواب معلوم ہوتا ہے۔

یہ باتیں تو ربوہ کی آبادی سے متعلق تھیں۔ اب میں وہ باتیں بیان کروں گا۔ جن کا تعلق معاشرتی، مذہبی اور علمی دنیا سے ہے۔ سب سے بڑھ کر جس بات سے متاثر ہوا وہ مکارم اخلاق ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ابتدائی ایام میں ایک دفعہ میرے والد صاحب یہاں تشریف لائے۔ گو وہ ربوہ سے ناواقف تھے۔ چنانچہ ایک احمدی نے پہلے تو ان کی خدمت

(بقیہ ص ۲۸)

آج سے سترہ برس پیشتر تعلیم الاسلام کالج قادیان کے افتتاح کے موقعہ پر

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ کی ایک نہایت بصیرت افروز تقریر

کالج کے قیام کی اغراض اور پروفیسروں کیلئے نہایت اہم ہدایات

مختلف علوم کے ماتحت اسلام پر جو اعتراض کئے جاتے ہیں ان کا رد انہی علوم کے ذریعہ کرنے کی کوشش کرو

اس امر کو ہمیشہ یاد رکھو کہ تمام سچے علوم اور نئی تحقیقاتیں اسلام کی مؤید ہیں

ہمیں کامل یقین ہے کہ احمدیت سے ایک ایسا تناور درخت پیدا ہونے والا ہے جس کے نیچے تمام دنیا آرام کریگی

۴ جون ۱۹۴۴ء کو تعلیم الاسلام قادیان کے افتتاح کے موقعہ پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ کی تقریر

تشہد، تعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور نے سورۃ تین کی تلاوت کی اور اس کے بعد فرمایا:-

یہ تقریب جو تعلیم الاسلام کالج کے افتتاح کی ہے اپنے اندر دوگونہ مقاصد رکھتی ہے۔

ایک مقصد

تو اشاعت تعلیم ہے جس کے بغیر تمدنی اور اقتصادی حالت کسی جماعت کی درست نہیں رہ سکتی۔ جہاں تک تعلیمی سوال ہے یہ کالج اپنے دروازے ہر قوم اور ہر مذہب کے لئے کھلا رکھتا ہے۔ کیونکہ تعلیم کا حصول کسی ایک قوم کے لئے نہیں ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم تعلیم کو بحیثیت ایک انسان ہونے کے ہر انسان کے لئے ممکن اور سہل الحصول بنا دیں۔ میں نے لاہور میں ایک دو ایسی انسٹی ٹیوٹ دیکھیں جن کے بانی نے یہ شرط لگا دی تھی کہ ان میں کسی مسلمان کا داخلہ ناجائز ہوگا۔ مجھ سے جب اس بات کا ذکر ہوا۔ تو میں نے کہا۔ اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے کہ مسلمان بھی ایسی ہی انسٹی ٹیوٹ قائم کریں۔ اور اس میں یہ اعلان کریں۔ کہ اس میں کسی غیر مسلم کا داخلہ ناجائز نہ ہوگا۔ کیونکہ ایک مسلم کا اخلاقی نقطہ نگاہ دوسری قوموں سے مختلف ہوتا ہے ہمیں جہاں تک تعلیم کا سوال ہے۔ ہماری پوری کوشش ہوگی۔ کہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے لئے تعلیم حاصل کرنا آسان ہو۔ اس کالج کے دروازے ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے لئے کھلے ہوں۔ اور انہیں ہر ممکن امداد اس انسٹی ٹیوٹ سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے دی جائے۔

دوسرا پہلو

اس کا یہ ہے۔ کہ آجکل کی تعلیم بہت سا اثر مذہب پر بھی ڈالتی ہے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ وہ غلط اثر ہوتا ہے کیونکہ وہ مذہب کے خلاف ہوتا ہے۔ ہم یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ خدا کا فعل اس کے قول کے خلاف ہوتا ہے۔ نہ ہم یہ ماننے کے لئے تیار ہیں کہ خدا کا قول اس کے فعل کے خلاف ہوتا ہے۔ ہمیں ایک اور ایک دو کی طرح یقین ہے کہ خواہ ہمارے پاس ایسے

آج سے سترہ برس پیشتر تعلیم الاسلام کالج قادیان کے افتتاح کے موقعہ پر

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ کی ایک نہایت بصیرت افروز تقریر

کالج کے قیام کی اغراض اور پروفیسروں کیلئے نہایت اہم ہدایات

مختلف علوم کے ماتحت اسلام پر جو اعتراض کئے جاتے ہیں اُن کا ردّ انہی علوم کے ذریعہ کرنے کی کوشش کرو

اس امر کو ہمیشہ یاد رکھو کہ تمام سچے علوم اور نئی تحقیقاتیں اسلام کی مؤید ہیں

ہمیں کامل یقین ہے کہ احمدیت کا بیج ایک ایسا تناور درخت پیدا ہونے والا ہے جس کے سایہ تلے تمام دنیا آرام کریگی

۴ر جون ۱۹۴۴ء کو تعلیم الاسلام کالج قادیان کے افتتاح کے موقعہ پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ کی تقریر

تشہد، تعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور نے معوذتین کی تلاوت کی اور اس کے بعد فرمایا:۔

یہ تقریب جو تعلیم الاسلام کالج کے افتتاح کی ہے اپنے اندر دوگونہ مقاصد رکھتی ہے۔

ایک مقصد

تو اشاعت تعلیم ہے۔ جس کے بغیر تمدنی اور اقتصادی حالت کسی جماعت کی درست نہیں رہ سکتی۔ جہاں تک تعلیمی سوال ہے یہ کالج اپنے دروازے ہر قوم اور ہر مذہب کے لئے کھلے رکھتا ہے۔ کیونکہ تعلیم کا حصول کسی ایک قوم کے لئے نہیں ہے۔ ہماری غرض ہے کہ ہم تعلیم کو بحیثیت ایک انسان ہونے کے ہر انسان کے لئے ممکن اور سہل الحصول بنا دیں۔ میں نے لاہور میں ایک دو ایسی انسٹی ٹیوٹ دیکھیں جن کے بانی نے یہ شرط لگا دی تھی کہ ان میں کسی مسلمان کا داخلہ ناجائز ہوگا۔ مجھ سے جب اس بات کا ذکر ہوا۔ تو میں نے کہا۔ اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے کہ مسلمان بھی ایسی ہی انسٹی ٹیوٹ قائم کریں۔ اور ان میں یہ واضح کریں۔ کہ ان میں کسی غیر مسلم کا داخلہ ناجائز ہوگا۔ کیونکہ ایک مسلم کا اخلاقی نقطہ نگاہ دوسری قوموں سے مختلف ہوتا ہے لیکن جہاں تک تعلیم کا سوال ہے۔ ہماری پوری کوشش ہوگی۔ کہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے لئے تعلیم حاصل کرنا آسان ہو۔ اس کالج کے دروازے ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے لئے کھلے ہوں۔ اور انہیں ہر ممکن امداد اس انسٹی ٹیوٹ سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے دی جائے۔

دوسرا پہلو

اس کا یہ ہے۔ کہ آجکل کی تعلیم بہت سا اثر مذہب پر بھی ڈالتی ہے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ وہ غلط اثر پڑتا ہے کیونکہ وہ مذہب کے خلاف ہوتا ہے۔ ہم یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ خدا کا فعل اس کے قول کے خلاف ہوتا ہے۔ نہ ہم یہ ماننے کے لئے تیار ہیں کہ خدا کا قول اس کے فعل کے خلاف ہوتا ہے۔ ہمیں ایک اور ایک دو کی طرح یقین ہے کہ خدا ہمارے سامنے ایسے

خواہ تم نہ بھی ہوں۔ جن سے ان اعتراضات کا اسی رنگ میں تجزیہ کیا جا سکتا ہو۔ جس رنگ میں وہ اسلام پر کئے جاتے ہیں یا ان علوم کے ذریعہ وہ اعتراضات کئے جاتے ہیں انہی علوم کے ذریعہ ان

اعتراضات کا رد

کیا جا سکتا ہو۔ پھر بھی یہ یقینی بات ہے کہ جو اعتراضات خدا تعالیٰ کی ہستی پر پڑتے ہیں یا جو اعتراضات خدا تعالیٰ کے رسولوں پر پڑتے ہیں یا جو اعتراضات اسلام کے بیان کردہ عقاید پر پڑتے ہیں وہ تمام اعتراضات غلط ہیں اور یقیناً کسی غلط استنباط کا نتیجہ ہیں۔ چونکہ اس قسم کے اعتراضات کا مرکز کالج ہوتے ہیں۔ اس لئے ہمارے کالج کے قیام کی ایک غرض یہ بھی ہے۔ کہ مذہب پر جو اعتراضات مختلف علوم کے ذریعہ کئے جاتے ہیں۔ ان کا انہی علوم کے ذریعہ رد کیا جائے۔ اور ہمارے کالج میں جہاں ان علوم کے پڑھانے پر پروفیسر رہیں وہاں ان کا ایک یہ کام بھی ہو۔ کہ وہ انہی علوم کے ذریعہ ان اعتراضات کو رد کریں اور دنیا پر ثابت کریں کہ اسلام پر جو اعتراضات ان علوم کے نتیجہ میں کئے جاتے ہیں وہ سراسر غلط اور بے بنیاد ہیں۔

پس جہاں دوسرے پروفیسروں کی غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ ان اعتراضات کو زیادہ سے زیادہ قوی کرتے چلے جائیں وہاں ہمارے پروفیسروں کی غرض یہ ہوگی کہ وہ ان اعتراضات کا زیادہ سے زیادہ رد کرتے چلے جائیں اب تک ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا۔ جس سے یہ کام سرانجام دیا جا سکتا۔ انفرادی طور پر ہماری جماعت میں پروفیسر موجود تھے۔ مگر وہ چنداں مفید نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ان کے لئے کوئی موقعہ تھا۔ کہ وہ اپنے مقصد اور مدعا کو منظم طور پر حاصل کر سکیں۔

پس جہاں ہمارے کالج کے منتظمین کو اور عملہ کو یہ کوشش کرنی چاہیئے۔ کہ غیر مذاہب کے طالب علم جو داخل ہونے کے لئے آئیں۔ ان کے دماغ میں کوئی ایسی روک نہ ہو جس کے نتیجہ میں وہ اس کالج کی تعلیم سے فائدہ حاصل نہ کر سکیں۔ وہاں منتظمین کو یہ بھی چاہیئے۔ کہ وہ کالج کے پروفیسروں کے ایسے دورے بنائیں جو ان مختلف قسم کے اعتراضات کو جو مختلف علوم کے ماتحت اسلام پر کئے جاتے ہیں۔ جمع کریں۔ اور اپنے طور پر ان کو رد کرنے کی کوشش کریں۔ اور ایسے رنگ میں تحقیقات کریں کہ نہ صرف عقلی اور مذہبی طور پر وہ ان اعتراضات کو رد کر سکیں بلکہ خود انہی علوم سے ہی وہ ان کی تردید کر دیں۔

میں نے دیکھا ہے بسا اوقات بعض علوم جو رائج ہوتے ہیں محض ان کی ابتدا کی وجہ سے لوگ ان سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ ذرا کوئی تھیوری نکل آئے تو بغیر اس کا ماحول دیکھے اور بغیر اس کے ماله اور ما علیہ پر کافی غور کرنے کے وہ ان سے متاثر ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور اسے علمی تحقیق قرار دے دیتے ہیں۔ مثلاً پچھلے سو سال سے

ڈارون تھیوری

نے انسانی دماغوں پر ایسا قبضہ کر لیا تھا کہ گو اس کا مذہب پر حملہ نہیں تھا۔ مگر لوگوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اس تھیوری کی وجہ سے تمام مذاہب باطل ہو گئے ہیں۔ کیونکہ

ارتقا کا مسئلہ ثابت ہو گیا ہے

حالانکہ جس مذہب پر اس تھیوری کا براہ راست حملہ ہو سکتا تھا وہ عیسائیت ہے۔ اسلام پر اس کا کوئی حملہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی طرح جہاں تک خدا تعالیٰ کے وجود کا علمی تعلق ہے ارتقاء کے مسئلہ کا مذہب کے خلاف کوئی اثر نہیں تھا صرف انتہائی حد تک پہنچ کر اس مسئلہ کا بعض صفات الٰہیہ کے ساتھ ٹکراؤ نظر آتا تھا اور درحقیقت وہ بھی غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ لیکن ایک زمانہ ایسا گذرا ہے۔ جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ ڈارون تھیوری کے خلاف کوئی بات کہنا عقل اور سائنس پر حملہ

گیا ہے۔ مگر اب ہم دیکھتے ہیں آہستہ آہستہ یہی یورپ جو کسی زمانہ میں ڈاروِن تھیوری کا قائل تھا اب اس میں

ایک زبردست رَو

اس تھیوری کے خلاف چل رہی ہے۔ اور اب اس پر نیا حملہ حساب کی طرف سے ہوا ہے۔ چنانچہ علم حساب کے ماہرین اس طرف آ رہے ہیں کہ یہ تھیوری بالکل غلط ہے۔ مجھے پہلے بھی اس قسم کے رسالے پڑھنے کا موقع ملا تھا مگر گزشتہ دنوں جب میں دہلی گیا۔ تو وہاں مجھے علم حساب کے ایک بہت بڑے ماہر پروفیسر ملے جنہیں پنجاب یونیورسٹی نے بھی پچھلے دنوں لیکچروں کے لئے بلایا تھا اور ان کے پانچ سات لیکچر ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ علم حساب کی رُو سے

یہ قطعی طور پر ثابت کیا جا چکا ہے

کہ سورج اڑتالیس ہزار سال میں اپنے محور کے گرد چکر لگاتا ہے۔ اور جب وہ اپنے اس چکر کو ختم کر دیتا ہے تو اس وقت مختلف سیاروں سے مل کر اس کی گرمی اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ اس گرمی کے اثر کی وجہ سے اس کے ارد گرد چکر لگانے والے تمام سیارے پگھل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ میں نے کہا اگر اڑتالیس ہزار سال میں تمام سیارے سورج کی گرمی سے پگھل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کی عمر اس سے زیادہ نہیں ہوتی۔ وہ کہنے لگے بالکل ٹھیک ہے دنیا کی عمر اس سے زیادہ ہرگز نہیں ہو سکتی۔ میں نے کہا ابھی ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے۔ کہ یہ علم قطعی طور پر صحیح ہے لیکن اگر آپ کی بات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ڈاروِن تھیوری اور جیالوجی کی پرانی تھیوری بالکل باطل ہے۔ وہ کہنے لگے یقیناً باطل ہیں۔ میں نے کہا

علوم کا اتنا بڑا ٹکراؤ

آپس میں کس طرح ہو گیا۔ انہوں نے کہا وہ تو علوم ہی نہیں عقلی ڈھکوسلے ہیں۔ اور ہم جو کچھ کہتے ہیں علم حساب کے رُو سے کہتے ہیں۔ بہرحال اب ایک ایسی رَو چل پڑی ہے کہ وہ بات جس کے متعلق سَو سال سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کے بغیر علم مکمل ہی نہیں ہو سکتا۔ اب اسی کو رد کرنے والے اور علوم ظاہر ہو رہے ہیں۔ اسی طرح نیوٹن کی تھیوری جو کشش ثقل کے متعلق تھی ایک لمبے عرصہ تک قائم رہی۔ مگر اب آئن سٹائن کے نظریے نے اس کا بہت سا حصہ باطل کر دیا ہے

اس سے پتہ لگتا ہے

کہ جن باتوں سے دنیا مرعوب ہو جاتی ہے۔ وہ بسا اوقات محض باطل ہوتی ہیں۔ اور ان کا لوگوں کے دلوں پر اثر ان کے علم کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ اپنی جہالت اور کم علمی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

جب دنیا میں بھی یہ حالات نظر آ رہے ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ مسائل جنہوں نے سینکڑوں سال تک دنیا پر حکومت کی۔ ہمارے پروفیسر ابھی سے یہ کوشش نہ کریں۔ کہ بجائے اس کے کہ بعد میں بعض اور علوم ان کو باطل کر دیں ہماری انسٹی ٹیوٹ پہلے ہی ان کا غلط ہونا ظاہر کر دے اور ثابت کر دے کہ اسلام پر ان علوم کے ذریعہ جو حملے کئے جاتے ہیں وہ درست نہیں ہیں۔ اگر وہ کوشش کریں تو میرے نزدیک ان کا اس کام میں کامیاب ہو جانا کوئی مشکل امر نہیں۔ بلکہ خدا کی مدد سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو دین قائم کیا ہے۔ اس کی مدد سے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام جو روشنی لائے ہیں اس کی مدد سے۔ اور احمدیت نے جو ماحول پیدا کیا ہے اس کی مدد سے وہ بہت جلد اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اور جو کام اور لوگوں سے کئی گنا عرصہ میں بھی نہیں ہو سکتا وہ ہمارے پروفیسر قلیل سے قلیل مدت میں سر انجام دے سکتے ہیں۔

پس میری غرض کالج کے قیام سے ایک یہ بھی ہے

کہ ہمیں ایک ایسا مرکز مل جائے جس میں ہم بیج کے طور پر ان تمام باتوں کو قائم کر دیں تاکہ آہستہ آہستہ اس بیج کے ذریعہ ایک ایسا درخت قائم ہو جائے۔ ایک ایسا نظام قائم ہو جائے۔ ایک ایسا ماحول قائم ہو جائے جو اسلام کی مدد کرنے والا ہو۔ جیسے یورپ میں نظام اسلام کے خلاف حملہ کرنے کے لئے دنیا میں قائم ہے۔

پس ہمارے کالج کے منتظمین کو مختلف علوم کے پروفیسرز کی ایسی سوسائٹیاں قائم کرنی چاہئیں۔ جن کی غرض یہ ہو کہ اسلام اور احمدیت کے خلاف بڑے بڑے علوم کے ذریعہ جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کا دفعیہ انہی علوم کے ذریعہ کریں۔ اور اگر وہ دیکھیں کہ موجودہ علوم کی مدد سے ان کا دفعیہ نہیں کیا جا سکتا۔ تو پھر وہ پوائنٹ نوٹ کریں۔ کہ کون کون سی ایسی باتیں ہیں جو موجودہ علوم سے حل نہیں ہوتیں اور نہ صرف خود ان پر غور کریں بلکہ کالج کے بالمقابل چونکہ ایک

سائنس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

بھی قائم کی گئی ہے۔ اس لئے وہ پوائنٹس نوٹ کر کے اس انسٹی ٹیوٹ کو بھجواتے رہیں۔ اور انہیں کہیں کہ تم بھی ان باتوں پر غور کرو۔ اور ہماری مدد کرو۔ کہ کس طرح اسلام کے مطابق ہم ان کی تشریح کر سکتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام ان باتوں کا محتاج نہیں۔

اسلام وہ مذہب ہے

جس کا خدا ایک زندہ خدا ہے۔ پس وہ سائنس کی تحقیقات کا محتاج نہیں۔ مثلاً یہی پروفیسر میڈرجن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ جب مجھے ملے تو انہوں نے بتایا کہ وہ اور نیویارک کے بعض دوسرے پروفیسر کئی تحقیقات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس ساری یونیورس کا ایک مرکز ہے۔ اس مرکز کا انہوں نے نام بھی لیا تھا جو مجھے صحیح طور پر یاد نہیں رہا۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے نظام عالم کا فلاں مرکز ہے جس کے گرد یہ سورج اور اس کے علاوہ اور لاکھوں کروڑوں سورج چکر لگا رہے ہیں اور انہوں نے کہا میری تھیوری یہ ہے کہ

یہی مرکز خدا ہے

گویا اس تحقیق کے ذریعہ ہم خدا کے بھی قائل ہو گئے ہیں نہیں کہ ہم دہریت کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ پہلے سائنس خدا تعالیٰ کے وجود کو رد کر رہی تھی۔ مگر اب ہم نے ثابت کر دیا ہے۔ کہ اس سارے نظام کا ایک مرکز ہے جو حکومت کر رہا ہے۔ اور وہی مرکز خدا ہے۔ میں نے کہا نظام عالم کے ایک مرکز کے متعلق آپ کی جو تحقیق ہے مجھے اس پر اعتراض نہیں۔ قرآن کریم سے بھی ثابت ہے کہ دنیا

ایک نظام کے ماتحت

ہے اور اس کا ایک مرکز ہے۔ مگر آپ کا یہ کہنا کہ یہی مرکز خدا ہے درست نہیں۔ میں نے ان سے کہا مجھ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہامات نازل ہوتے ہیں اور کئی ایسی باتیں ہیں جو اس نے کلام اور الہام کے ذریعہ مجھے قبل از وقت بتا دیا ہے۔ آپ بتائیں کہ کیا آپ جس مرکز کو خدا کہتے ہیں وہ بھی کسی پر الہام نازل کر سکتا ہے۔ وہ کہنے لگے۔ الہام تو نازل نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا تو پھر میں کس طرح تسلیم کر لوں کہ یہی مرکز خدا ہے۔ مجھے تو ذاتی طور پر اس بات کا علم ہے کہ

خدا مجھ سے باتیں کرتا ہے

اور وہ باتیں اپنے وقت پر پوری ہو جاتی ہیں۔ کوئی بات چھ مہینے کے بعد پوری ہو جاتی ہے۔ کوئی سال کے بعد پوری ہو جاتی ہے۔ کوئی دو سال کے بعد پوری ہو جاتی ہے اور اس طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ مجھ پر جو الہام نازل ہوتا ہے خدا کی طرف سے ہی ہوتا ہے۔ پھر میں نے انہیں مثال دی اور کہا آپ مجھے بتائیں کیا آپ کا وہ گروہ جسے آپ خدا قرار دیتے ہیں کسی کو یہ بتا سکتا ہے کہ امریکہ کی طرف سے

انگلستان کی مدد کے لئے

انھیں سے ہوتی جہاز بھجوایا جائے گا۔ وہ کہنے لگے۔ اس کرہ سے تو کوئی ایسی بات کسی کو نہیں بتائی جا سکتی۔ میں نے کہا۔ تو پھر ماننا پڑے گا کہ اس کرے کا اور اسی طرح اور کروں کا خدا کوئی اور ہے۔ یہ خدا اپنی ذات میں خدا نہیں ہیں۔ کیونکہ آپ تسلیم کرتے ہیں کہ اس مرکز کے ذریعہ کسی کو کوئی خبر قبل از وقت نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن میں اپنے تجربہ سے جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام انسان پر نازل ہوتا ہے جو کئی قسم کی غیب کی خبروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پس آپ بیشک اس مرکز کو ہی خدا مان لیں۔ لیکن ہم تو

ایک علیم و خبیر ہستی

کو خدا کہتے ہیں۔ اس کے اندر قدرت بھی ہوتی ہے اس کے اندر جلال بھی ہوتا ہے۔ اس کے اندر جمال بھی ہوتا ہے اس کے اندر علم بھی ہوتا ہے۔ اس کے اندر حکمت بھی ہوتی ہے اس کے اندر ربط کی صفت بھی ہوتی ہے۔ اس کے اندر محیی ہونے کی صفت بھی ہوتی ہے۔ اس کے اندر ممیت ہونے کی صفت بھی ہوتی ہے۔ اس کے اندر حلیم ہونے کی صفت بھی ہوتی ہے۔ اس کے اندر واسع ہونے کی صفت بھی ہوتی ہے غرض

بیسیوں قسم کی صفات ہیں

جو اس کے اندر پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح اس کا نور ہونا اس کا وہاب ہونا۔ اس کا شکور ہونا۔ اس کا غفور ہونا۔ اس کا رحیم ہونا۔ اس کا ودود ہونا۔ اس کا کریم ہونا۔ اس کا ستار ہونا اور اسی طرح اور کئی صفات کا اس کے اندر پایا جانا ہم تسلیم کرتے ہیں۔ گویا یہ صفات اس مرکز میں بھی پائی جاتی ہیں جس کو آپ خدا کہتے ہیں۔ جب ایک طرف اس کے اندر یہ صفات نہیں پائی جاتیں اور دوسری طرف ہم پر ایک ایسی ہستی کی طرف سے الہام نازل ہوتا ہے جس میں یہ تمام صفات پائی جاتی ہیں جو اپنی ان صفات کو اپنے کلام کے ذریعہ دنیا پر ظاہر کرتا ہے۔ اور باوجود اس کے کہ ساری دنیا مخالفت کرتی ہے۔ پھر بھی اس کا کلام پورا ہو جاتا ہے اور جو کچھ اس نے کہا ہوتا ہے وہی کچھ دنیا کو دیکھنا پڑتا ہے تو اس ذاتی مشاہدہ کے بعد ہم آپ کی تھیوری کو کس طرح مان سکتے ہیں۔ اس پر وہ کہنے لگا اگر یہ باتیں درست ہیں تو پھر ماننا پڑے گا کہ

یہ تھیوری باطل ہے

اس کلام کے ہوتے ہوئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کوئی ایسا خدا نہیں جس کے تابع یہ تمام مرکز ہوں۔ تو مذہب کے لحاظ سے ہم ان چیزوں کے محتاج نہیں ہیں۔ ہمارے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہم سائنس کے علوم کی مدد سے خدا تعالیٰ کو حاصل کریں خدا بغیر سائنس کے بھی انسان کو مل جاتا ہے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی دیکھ لو

آپ نے نہ فلسفہ پڑھا نہ سائنس پڑھی۔ نہ حساب پڑھا نہ کوئی اور علم سیکھا۔ مگر پھر خدا آپ سے اس طرح بولا۔ کہ آج تک نہ کسی سائنسدان کو وہ نعمت نصیب ہوئی ہے نہ کسی حساب دان کو وہ نعمت نصیب ہوئی ہے۔ نہ کسی فلسفی کو وہ نعمت نصیب ہوئی ہے۔ اسی طرح حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بھی نہ یہ فلسفہ پڑھا نہ یہ سائنس پڑھی نہ یہ حساب پڑھا لیکن جس رنگ میں خدا نے آپ سے کلام کیا وہ نہ کسی فلسفے والے کو نصیب ہوا نہ کسی سائنس والے کو نصیب ہوا۔ نہ کسی حساب والے کو نصیب ہوا۔ اسی طرح اب میرے ساتھ جس طرح خدا متواتر کلام کرتا اور اپنے غیب کی خبریں مجھ پر ظاہر فرماتا ہے یہ نہ سائنس کا نتیجہ ہے نہ فلسفے کا نتیجہ ہے نہ حساب کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ میں نے نہ سائنس پڑھی ہے نہ فلسفہ پڑھا ہے۔ نہ حساب پڑھا ہے تو ہمیں کسی سائنس یا فلسفہ یا حساب کی مدد کی ضرورت نہیں۔ بلکہ وہ لوگ جو دن رات ان علوم میں محو رہتے ہیں ان میں سے بھی

ایک طبقہ ایسا ہے

کہ اگر ہم اس کے سامنے اپنے الہامات پیش کریں اور وہ ان پر

غور کرے۔ تو ہمیں امید ہے کہ وہ سمجھ جائے گا۔ جیسے پروفیسر مذکور جب میرے پاس آیا اور میں نے اس سے سنجیدگی کے ساتھ باتیں کیں۔ تو وہ حقیقت کو سمجھ گیا۔ اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ واقعہ میں مجھے قبل از وقت الہام کے ذریعہ کئی خبریں دی گئی تھیں۔ جو اپنے وقت پر پوری ہوئیں اس وجہ سے اس کی راہ میں مشکلات تھیں۔ لیکن اس نے اتنا ضرور تسلیم کر لیا کہ اگر الہام ثابت ہو جائے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ جس تھیوری کو میں پیش کرتا ہوں وہ غلط ہو جیسے ہیں۔

الہام کا امکان

تسلیم کرتے ہوئے اپنی تھیوری کو غلط مان لیا تو وہ جن کے سامنے الہام پورے ہوتے ہیں۔ وہ ایسی تھیوری کو کب مان سکتے ہیں۔ وہ تو ایسے ہی خدا کو مان سکتے ہیں جو قادر ہے کریم ہے۔ رحیم ہے۔ عزیز ہے۔ سمیع ہے۔ مجیب ہے حفیظ ہے۔ اسی طرح اور کئی صفات حسنہ کا مالک ہے۔ اپنی آنکھوں دیکھی چیز کو کون رد کر سکتا ہے۔ تو سائنس بھی اور فلسفہ بھی اور حساب بھی جہاں تک خدا کا تعلق ہے۔ ایک تھیوری سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ ان کو ماننے والا کہہ سکتا ہے کہ شاید یہ غلط ہوں یا شاید یہ صحیح ہوں اسے قطعی اور یقینی وثوق ان علوم کی سچائی پر نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہمیں خدا تعالیٰ کی ذات پر جو یقین ہے۔ اور وہ ہر قسم کے شبہات سے بالاتر ہے۔ وہ یقین ایسا ہی ہے جیسے حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں۔ کہ اے خدا میں سورج کا انکار کر سکتا ہوں۔ میں اپنے وجود کا انکار کر سکتا ہوں۔ مگر جس طرح تو مجھ پر ظاہر ہوا ہے میں اس کا کبھی انکار نہیں کر سکتا۔

یہ وہ یقین ہے

جو خدا پر ایمان لانے والوں کو حاصل ہوتا ہے۔ مگر کیا ایسا یقین کسی سائنسدان کو اپنے کسی سائنس کے مسئلہ کی سچائی پر ہو سکتا ہے۔ یا کب ایسا یقین کسی حساب دان کو اپنے حساب کے کسی مسئلہ کی سچائی پر ہو سکتا ہے۔ پہلے سمجھا جاتا تھا کہ حساب قطعی اور یقینی چیز ہے مگر اب نئی نئی باتیں ایسی ہوئی ہیں جن کی وجہ سے حساب کے متعلق بھی شبہات پیدا ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ مگر حساب سے عام سود حصہ والا حساب مراد نہیں۔ بلکہ وہ حساب مراد ہے جو فلسفہ کی حد تک پہنچا ہوا ہے اور فلسفہ خود مشکوک ہوتا ہے۔ ہر زمانہ میں جو فلاسفر ظاہر ہوتا ہے۔ **اس کے علوم کا انکار کرنے والا علوم جدیدہ کا منکر** قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن ابھی پچاس ساٹھ سال نہیں گزرتے کہ ایک اور فلسفی کھڑا ہو جاتا ہے جو اس پہلے فلاسفر کی تحقیق کو غلط قرار دے دیتا اور نئے نظریات پیش کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس وقت جو لوگ اس کے نظریات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں لوگ ان کے متعلق یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ وہ علوم جدیدہ کے منکر ہیں مگر پچاس ساٹھ سال نہیں گذرتے کہ ایک اور فلاسفر اس تحقیق کو قدیم تحقیق قرار دے کر ایک نئی تحقیق لوگوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے اور پہلی تحقیق کو غلط قرار دے دیتا ہے۔ کیا تم نے کبھی دیکھا ہے کہ

خدا کا وجود

بھی غلط قرار دیا گیا ہو۔ یا کبھی کوئی نبی ایسا کھڑا ہوا ہو جس نے کہا ہو۔ کہ خدا کے متعلق لوگوں کے دلوں میں جو خیال پایا جاتا تھا وہ موجودہ تحقیق نے غلط ثابت کر دیا ہے۔ آدم سے لے کر اب تک ہمیشہ ایسے وجود آتے رہے ہیں جنہوں نے اپنے تجربہ اور مشاہدہ سے دنیا کے سامنے یہ حقیقت پیش کی کہ

اس دنیا کا ایک خدا ہے

اور پھر دلائل و براہین سے اس کے وجود کو ایسا ثابت کیا کہ دنیا ان دلائل کا انکار نہ کر سکی۔ انہوں نے کہا کہ ہم خدا کی طرف سے کھڑے ہوئے ہیں اور خدا کی ہستی کا ثبوت یہ ہے

کہ وہ ہمیں کامیاب کرے گا۔ چنانچہ دنیا نے ان کی مخالفت کی۔ مگر خدا نے ان کو کامیاب کر کے دکھا دیا۔ اور اس طرح ثابت کر دیا کہ اس عالم کا حقیقتاً ایک قادر اور مقتدر خدا ہے جو اپنے پیاروں سے کلام کرتا اور مخالف حالات میں ان کو کامیاب کرتا ہے پس خدا کے وجود پر انبیا کی متفقہ گواہی

ایک قطعی اور یقینی شہادت

ہے جو اس کی ہستی کو ثابت کر رہی ہے۔ آج تک کوئی نبی دنیا میں ایسا نہیں آیا۔ جس نے اپنے سے پہلے آنے والے نبی کی تردید کی ہو۔ ہر سائنسدان پہلے سائنسدان کی تردید کرتا ہے۔ ہر فلاسفر پہلے فلاسفر کی تردید کرتا ہے ہر حساب دان پہلے حساب دان کی تردید کرتا ہے۔ مگر انبیاء کا وجود ایسا ہے کہ ہر نبی جو دنیا میں آتا ہے وہ اپنے سے پہلے آنے والے انبیاء کی تصدیق ہی کرتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ ان کی تردید کرے۔ وہ ان کی لائی ہوئی صداقتوں کو باطل ثابت کرے۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں پیش کیا تھا جسے انہوں نے غلطی سے نہ سمجھا اور اعتراض کر دیا کہ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ یعنی

دنیا میں ایک ہی سلسلہ ہے

جس میں ہر آنے والا اپنے سے پہلے کی تصدیق کرتا ہے۔ اس کی تکذیب اور تردید نہیں کرتا۔ آدم سے لیکر حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم تک اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر مسیح موعودؑ تک ایک نبی بھی ایسا نہیں دکھایا جا سکتا۔ جس نے پہلے انبیاء اور ان کی لائی ہوئی صداقتوں کا انکار کیا ہو۔ بلکہ وہ ہمیشہ پہلوں کی تصدیق کرتے ہے لیکن دوسرے تمام علوم چونکہ ظنی ہیں۔ وہمی اور خیالی ہیں۔ اس لئے ہر نئی سائنس پہلی سائنس کی تردید کرتی ہے اور ہر نیا فلسفہ پہلے فلسفہ کی تردید کرتا ہے۔ ہر نیا حساب پہلے حساب کی تردید کرتا ہے بیشک انبیاء کی تعلیمیں منسوخ بھی ہوتی ہیں۔ مگر

منسوخ ہونا اور چیز ہے

اور ان تعلیموں کو غلط قرار دینا اور چیز ہے۔ فلسفہ والے کہتے ہیں کہ فلاں زمانہ میں جو فلسفی گزرا تھا۔ اس کا فلسفہ غلط تھا۔ کیونکہ نئی تحقیقات نے اس کو باطل ثابت کر دیا ہے۔ سائنسدان کہتے ہیں پہلے سائنسدانوں نے غلطی کی۔ انہوں نے فلاں فلاں مسائل بالکل غلط بیان کئے تھے۔

اسی طرح علم حساب کی تحقیق ہوتی ہے حساب دان یہ کہتے ہیں کہ فلاں حساب دان نے یہ غلطی کی تھی اور فلاں حساب دان نے وہ غلطی کی تھی۔ لیکن

دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہوا

کہ کوئی نبی مبعوث ہوا ہو۔ اور اس نے یہ کہا ہو کہ فلاں نبی نے غلط بات کہی تھی۔ انبیاء سابقین کی تعلیمیں بیشک منسوخ ہوتی رہی ہیں۔ مگر منسوخ ہونے کے یہ معنے نہیں تھے کہ وہ تعلیمیں غلط تھیں۔ ان تعلیموں کے منسوخ ہونے کا

صرف اتنا مفہوم ہے

کہ وہ تعلیمیں اس زمانہ کے لئے تھیں بعد کے زمانہ کے لئے نہیں تھیں۔

پس ہمیں ذاتی طور پر اسبات کی ضرورت نہیں کہ ہم سائنس اور فلسفہ اور حساب اور دوسرے علوم کے ذریعہ اسلام کی صداقت ثابت کریں۔ اسلام ان سب سے بالا ہے۔ لیکن چونکہ دنیا میں کچھ لوگ ان

وہموں میں مبتلا

ہیں۔ اور وہ ان علوم کے رعب کی وجہ سے اسلام کی تائید میں اپنی آواز بلند نہیں کر سکتے۔ اس لئے ان کی ہدایت اور راہ نمائی کے لئے ضروری ہے کہ ہم ایسے مرکز کھولیں۔ اور ان کی زبان میں ان سے باتیں کرنے کی کوشش کریں۔ اور انہیں بتائیں۔ کہ علوم جدیدہ کی نئی تحقیقاتیں بھی

اسلام کی مؤید ہیں

اسلام کی تردید کرنے والی اور اس کو غلط ثابت کرنے والی نہیں ہیں۔ یہ کام ہے جو ہمارے سامنے ہے چونکہ یہ نیا کام ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہمیں اس کام میں دقتیں پیش آئیں۔ لیکن ایک وقت آئے گا۔ جب آہستہ آہستہ ان علوم کے ذریعہ بھی اسلام کی صداقت دنیا کے کونہ کونہ میں پھیل جائے گی۔ اور لوگ محسوس کریں گے کہ علوم خواہ کس قدر بڑھ جائیں۔ سائنس خواہ کس قدر ترقی کر جائے۔ اسلام کے

کسی مسئلہ پر زد نہیں پڑ سکتی

دنیا میں ہمیشہ دشمن کے قلعہ پر پہلے گولہ باری کی جاتی ہے۔ اور یہ گولہ باری فوج کا بہت بڑا کام ہوتا ہے۔ لیکن جب گولہ باری کرتے کرتے قلعہ میں سوراخ ہو جاتا ہے تو پھر فوج اس سرعت سے بڑھتی ہے کہ دشمن کے لئے ہتھیار ڈال دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔

ہم نے بھی کفر کے مقابل میں ایک بنیاد رکھی ہے اور

ہماری مثال بالکل ایسی ہی ہے

جیسے پرانے زمانہ کی منجنیقیں اپنے ہاتھ میں لے کر کوئی شخص موجودہ زمانہ کے مضبوط ترین قلعوں کو سر کرنے کی کوشش کرے یا غلیلوں سے دشمن کو شکست دینے کا ارادہ کرے ہم کو بھی جب دیکھنے والا دیکھتا ہے تو کہتا ہے یہ لوگ کیا کریں گے۔ وہ عظیم الشان قلعے جو کنکریٹ کے بنے ہوتے ہیں۔ جن کی تعمیر میں بڑے بڑے قیمتی مسالے صرف ہوتے ہیں۔ جن کو الیون انچ گنز Eleven powder Guns ٹی فائیو ملی میٹر گنز 75 M-Motor Guns بھی بمشکل سر کرسکتی ہیں۔ ان قلعوں کو وہ ان پتھروں یا غلیلوں سے کس طرح توڑ سکیں گے۔ مگر جو خدا کی طرف سے کام ہوتے ہیں وہ اسی طرح ہوتے ہیں۔ پہلے دنیا ان کو دیکھتی ہے اور کہتی ہے۔ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ مگر

پھر ایک دن ایسا آتا ہے

جب وہی دنیا کہتی ہے۔ اس کام نے تو ہونا ہی تھا کیونکہ حالات ہی ایسے پیدا ہو چکے تھے۔ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آئے۔ تو لوگوں نے اس وقت یہی کہا کہ ان مقصدوں کا پورا ہونا ناممکن ہے۔ انہوں نے آپ کو مجنوں کہا۔ انہوں نے آپ کے متعلق یہ کہا۔ اس شخص پر نعوذ باللہ ہمارے بتوں کی لعنت پڑ گئی ہے۔ مگر آج یورپ کے مصنفوں کی کتابیں پڑھ کر دیکھ لو۔ وہ کہتے ہیں اگر مسلمانوں کے مقابلہ میں قیصر کی حکومت کو شکست ہو گئی۔ اگر مسلمانوں کے مقابلہ میں کسریٰ کی حکومت کو شکست ہو گئی۔ اگر مسلمانوں کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی قوم نہیں ٹھہر سکی۔ تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ وہ زمانہ ہی ایسا تھا اور اس وقت حالات ہی ایسے پیدا ہو چکے تھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید میں تھے۔

کیا یہ عجیب بات نہیں

کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو آپ کے دعوے کو پاگل پن اور جنون سمجھا جاتا تھا۔ مگر آج یہ کہا جاتا ہے کہ اگر آپ کے دعوے کو لوگوں نے تسلیم کر لیا۔ تو اس میں کون سی عجیب بات ہے زمانہ کے حالات اس دعوے کے مطابق تھے اور لوگوں کی طبائع آپ کے عقاید کو تسلیم کرنے کیلئے پہلے ہی تیار ہو چکی تھیں۔ یہی احمدیت کا حال ہے۔ جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دعوے کیا تو لوگ کہتے تھے کہ ناممکن ہے کہ یہ شخص دنیا پر فتح حاصل کر سکے یہ جلدی ہی آپ مر جائے گا۔ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی تک نے یہ کہہ دیا کہ میں نے ہی اس شخص کو بڑھایا تھا اور اب میں ہی اس کو گرا دوں گا۔

(اشاعۃ السنۃ جلد ۱۳ عدد ۱ سنہ [illegible])

مگر آپ کے سلسلہ کو دن بدن ترقی ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ شخص جسے قادیان میں بھی لوگ اچھی طرح نہیں جانتے

تھے - اس کی جماعت پہلے پنجاب کے مختلف حلقوں میں پھیلنی شروع ہوئی - پھر پنجاب سے بڑھی اور افغانستان میں گئی - بنگال میں گئی - بمبئی میں گئی - مدراس میں گئی یو - پی میں گئی - سندھ میں گئی - بہار میں گئی - اڑیسہ میں گئی - سی پی میں گئی - آسام میں گئی - اور پھر ہندوستان سے بڑھ کر بیرونی ممالک میں پھیلنی شروع ہوئی چنانچہ انگلستان میں احمدیت پھیلی - جرمنی میں احمدیت پھیلی ہنگری میں احمدیت پھیلی - امریکہ میں احمدیت پھیلی - ارجنٹائن میں احمدیت پھیلی - یوگوسلاویہ میں احمدیت پھیلی - البانیہ میں احمدیت پھیلی - پولینڈ میں احمدیت پھیلی - زیکوسلوویکیا میں احمدیت پھیلی - سیرالیون میں احمدیت پھیلی - گولڈ کوسٹ میں احمدیت پھیلی - نائیجیریا میں احمدیت پھیلی - مصر میں احمدیت پھیلی - مشرقی افریقہ میں احمدیت پھیلی - ماریشس میں احمدیت پھیلی فلسطین میں احمدیت پھیلی - شام میں احمدیت پھیلی - روس میں احمدیت پھیلی - کاشغر میں احمدیت پھیلی - ایران میں احمدیت پھیلی - سٹریٹ سیٹلمنٹس میں احمدیت پھیلی - جاوا میں احمدیت پھیلی - ملایا میں احمدیت پھیلی - چین میں احمدیت پھیلی - جاپان میں احمدیت پھیلی - غرض

دنیا کے کناروں تک احمدیت پہنچی

اور پھیلی - اور لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ دنیا میں کچھ پاگل لوگ بھی ہوتے ہیں - اگر چند پاگلوں نے احمدیت کو مان لیا ہے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں - مگر ابھی زیادہ زمانہ نہیں گذرے گا کہ دنیا میں احمدیت کی ایسی مضبوط بنیاد قائم ہو جائے گی کہ یہ نہیں کہا جائے گا کہ احمدیت کی فتح کی امید ایک مجنونانہ خیال ہے - بلکہ کہا جائے گا کہ احمدیت کو مار دینے کا خیال ایک مجنونانہ خیال ہے وہ دن دور نہیں کہ وہی لوگ جو آج احمدیت کی ترقی کو ایک ناممکن چیز قرار دے رہے ہیں جب اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے - کہ احمدیت ترقی کر گئی ہے - احمدیت ساری دنیا پر چھا گئی ہے - احمدیت نے روحانی لحاظ سے ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے - تو وہی لوگ کہیں گے احمدیت کی کامیابی اور اس کی فتح کوئی معجزہ نہیں - اگر احمدیت فتحیاب نہ ہوتی - تو کیا ہوتا - اس وقت یورپ اتنا مضمحل ہو چکا تھا - اس وقت انسانی دماغ اتنا پراگندہ ہو چکا تھا - اس وقت سائنس اپنی حد بندیوں کو توڑ کر اس طرح کا ایک فلسفہ بن چکی تھی - کہ اگر احمدیت نے فتح پائی تو یہ کوئی معجزہ نہیں - اس وقت کے حالات ہی اس فتح کو پیدا کر رہے تھے -

پس یہ بیج جو ہم بو رہے ہیں ہم جانتے ہیں کہ یہ دنیا میں پھیل کر رہے گا - ہمیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں - کہ ہم امید رکھتے ہیں کہ یہ بیج پھیل جائے گا - ہمیں یہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں - کہ ہمارا خیال ہے کہ یہ بیج کبھی ضائع نہیں ہوگا - ہم خدا کی طرف سے مانتے ہیں اور اس بات پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ یہ

بیج ایسا ہے

جس میں سے ایک دن ایسا تناور درخت پیدا ہونے والا ہے جس کے سایہ میں بیٹھنے کے لئے لوگ مجبور ہوں گے اور اگر وہ نہیں بیٹھیں گے تو تپتی دھوپ میں وہ اپنے خون کو جھلسائیں گے اور انہیں دنیا میں کہیں آرام کی جگہ نہیں ملے گی

پس ہم جانتے ہیں کہ جس راستہ کو ہم نے اختیار کیا ہے - وہ ضرور ہمیں کامیابی تک پہنچانے والا ہے کسی خیال کے ماتحت نہیں - کسی وہم اور گمان کے ماتحت نہیں بلکہ اس علیم و خبیر ہستی کے بتانے کی وجہ سے

یہ یقین ہمیں حاصل ہوا ہے

جو کبھی جھوٹ نہیں بولتی - جس کی بتائی ہوئی بات کبھی غلط نہیں ہو سکتی - یہ ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں پر عیسائی گر گئے ہم نے انہیں اس کالج میں پروفیسر مقرر کیا ہے - ان

میں سے بعض نااہل ثابت ہوں مگر اُن کے نااہل ثابت ہونے کی وجہ سے اس کام میں کوئی نقص واقعہ نہیں ہو سکتا۔ جس طرح دریا کے دھارے کے سامنے پتھر آجائے تو وہ بہہ جاتا ہے۔ مگر دریا کے دھارے کو وہ روک نہیں سکتا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص غلط کام کرتا ہے یا اپنے کام کے لئے کوئی غلط طریق اختیار کرتا ہے یا وہ احمدیت کے دریا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے وہ اپنی تباہی کے آپ سامان پیدا کرتا ہے وہ مٹ جائیگا مگر جس دریا کو خدا نے چلایا ہے جس کی حفاظت کے لئے اس نے اپنے فرشتوں کو آپ مقرر کیا ہے دنیا کی کوئی طاقت اس کے بہاؤ کو روک نہیں سکتی۔ خواہ وہ یورپ کی ہو۔ خواہ وہ امریکہ کی ہو۔ خواہ وہ ایشیا کی ہو اور خواہ وہ دنیا کے کسی اور ملک کی ہو۔

ہمیں نظر آرہا ہے کہ خدا تعالیٰ کے فرشتے

یورپ میں بھی اتر رہے ہیں۔ امریکہ میں بھی اتر رہے ہیں۔ ایشیا میں بھی اتر رہے ہیں۔ اور ہر شخص جو اس مشن کا مقابلہ کرتا ہے۔ ہر شخص جو خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے پیغام کو رد کرتا ہے وہ اپنی ہلاکت کے آپ سامان کرتا ہے۔ آج اور کل اور پرسوں اور ترسوں دن گزرتے چلے جائیں گے زمانہ بدلتا چلا جائے گا۔ انقلاب بڑھتا چلا جائے گا۔ اور تغیر وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے گا۔ روز بروز اس سلسلہ کی راہ سے روکیں دور ہوتی جائیں گی۔ روز بروز یہ دریا زیادہ سے زیادہ فراخ ہوتا چلا جائے گا دریا کے منبع کے پاس چھوٹے چھوٹے نالے ہوتے ہیں۔ جن پر سے ہر شخص آسانی سے کود کر گذر سکتا ہے۔ میں نے خود جہلم کے منبع کے پاس ایسے نالے دیکھے ہیں اور میں خود بھی ان نالوں پر سے کود کر گذرا ہوں۔ مگر آہستہ آہستہ دریا اتنا وسیع ہوتا جاتا ہے کہ بڑے سے بڑے گاؤں اور بڑے بڑے شہر بہا کر لے جاتا ہے۔ اسی طرح ابھی ہم دریا کے منبع کے قریب ہیں۔ ایک زمانہ ایسا گذرا ہے جب لوگ ہماری جماعت کے متعلق سمجھتے تھے کہ یہ ایک نالے کی طرح ہے۔ جو شخص چاہے اس پر سے کود کر گذر جائے مگر اب ہم ایک نہر کی طرح بن چکے ہیں۔ لیکن ایک دن آئے گا۔ جب دنیا کے بڑے سے بڑے دریا کی وسعت بھی اس کے مقابلہ میں حقیر ہو جائے گی۔ جب اس کا پھیلاؤ اتنا وسیع ہو جائے گا۔ جب اس کا بہاؤ اتنی شدت کا ہوگا۔ کہ دنیا کی کوئی عمارت اور دنیا کا کوئی قلعہ اس کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکے گا

پس ہمارے پروفیسروں کے سپرد وہ کام ہیں جو خدا اور اس کے فرشتے کر رہے ہیں۔ اگر وہ دیانتداری کے ساتھ کام کریں گے تو یقیناً کامیاب ہوں گے اور اگر وہ غفلت کریں گے تو ہم یہی دعا کریں گے کہ خدا انہیں توبہ کی توفیق دے اور انہیں محنت سے کام کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔ لیکن اگر وہ اپنی اصلاح نہیں کریں گے تو وہ اس سلسلہ کی ترقی میں ہرگز روک نہیں بن سکیں گے۔ جس طرح ایک مچھر بیل کے سینگ پر بیٹھ کر اسے تھکا نہیں سکتا۔ اسی طرح ایسے کمزور انسان احمدیت کو کسی قسم کی تھکاوٹ اور ضعف نہیں پہنچا سکیں گے۔

فرمایا:۔ جن سوالات کو اس وقت میرے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ ان سب کے متعلق میں ابھی فوری طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن

جہاں تک لباس کا سوال ہے

میری رائے یہ ہے کہ ہمیں تعلیم کو آسان اور سہل الحصول بنانا چاہیئے۔ اور کوئی ایسا بوجھ نہیں ڈالنا چاہیئے۔ جسے طالب علم برداشت نہ کر سکیں تا ایسا نہ ہو کہ غریب لڑکے اس بوجھ کی وجہ سے تعلیم سے محروم رہ جائیں۔

جہاں تک کھیلوں کا تعلق ہے

مجھے افسوس ہے کہ کالجوں میں بعض ایسی کھیلیں اختیار

کر لی گئی ہیں۔ جن پر روپیہ بھی صرف ہوتا ہے اور صحت پر بھی وہ برا اثر ڈالتی ہیں۔ میں نے یورپین رسالوں میں پڑھا ہے۔ انگلستان میں کھیلوں کے متعلق ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ جس نے بہت کچھ غور کے بعد یہ رپورٹ پیش کی ہے کہ ہاکی کے کھلاڑیوں میں سل کا مادہ زیادہ پایا جاتا ہے۔ یہ تحقیق تو آج کی گئی ہے لیکن میں نے آج سے ۱۸ سال پہلے اس کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اور میں نے کہا تھا کہ میں

ہاکی سے نفرت کرتا ہوں

یہ صحت کے لئے مضر ہے۔ اس سے سینہ کمزور ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جھک کر کھیلنا پڑتا ہے۔

(الفضل جلد ۱۱ نمبر ۴۹ ص۴ مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۹۲۳ء)

اسی طرح بعض اور مواقع پر بھی میں توجہ دلاتا رہا ہوں کہ ہاکی قطعی طور پر صحت پر اچھا اثر پیدا نہیں کرتی بلکہ مضر اثر کرتی ہے۔ ہاکی میں ہاتھ جڑے رہتے ہیں۔ اور سانس سینہ میں پھولتا نہیں۔ اس طرح باوجود کھیلنے کے سینہ چوڑا نہیں ہوتا۔

(الفضل ۳۱ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

جب میں نے یہ بات کہی۔ اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ ہاکی سے سینہ کمزور ہو کر

سل کا خطرہ

پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر اب دوسرے لوگ بھی آہستہ آہستہ اسی طرف آرہے ہیں۔ عزیزم مرزا ناصر احمد کا ان الفاظ میں کہ "وہ تمام قومیں جو انگریز یا انگریزی قوم سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ ان کھیلوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتیں۔ اور ان کی زیادہ توجہ ایتھلیٹکس Athletics کی طرف رہتی ہیں۔ اور اس وجہ سے ان قوموں کے طلباء کی صحتوں پر کوئی بڑا اثر نظر نہیں آتا" غالباً

جرمنی کی طرف اشارہ ہے

جہاں ان کھیلوں پر بہت کم زور دیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کھیلوں پر روپیہ اور وقت زیادہ خرچ ہوتا ہے مگر صحت کو کم فائدہ پہنچتا ہے۔ چنانچہ ان کھیلوں کی بجائے انہوں نے جو دوسری کھیلیں اختیار کی ہیں۔ ان کا صحت پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے۔ اور روپیہ بھی کم خرچ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری کھیلوں کا رواج اب دن بدن بڑھ رہا ہے۔ انگریزی ممالک میں شاید اس وجہ سے کہ وہاں کہر زیادہ ہوتی ہے۔ اس قسم کی کھیلوں کی ضرورت سمجھی جاتی ہے جو دوڑ دھوپ والی ہوں لیکن وسطی یورپ یا

جنوبی یورپ میں

ان کا زیادہ رواج نہیں۔ میں یورپین کھیلوں میں سب سے کم مضر فٹ بال سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس سے سینہ پر بوجھ نہیں پڑتا۔ بلکہ سینہ چوڑا اور فراخ رہتا ہے۔ ہاکی میں چونکہ دونوں ہاتھ بند ہوتے ہیں۔ ادھر سانس سینہ میں پھولتا نہیں۔ اس لئے ہاکی کے نتیجہ میں اکثر سینہ پر زیادہ بوجھ پڑتا ہے۔ کہ وہ کمزور ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ میں ہمیشہ ہاکی کو مضر سمجھتا رہا ہوں۔ مگر اب چار پانچ سال ہوئے انگلستان میں

ایک کمیشن

مقرر کیا گیا تھا۔ جس نے تحقیق کے بعد یہ رپورٹ کی ہے۔ کہ ہاکی پلیئرز میں سل کا مادہ نسبتاً زیادہ دیکھا گیا ہے۔ بہرحال یہ ایک ابتدائی کام ہے۔ اور جیسا کہ بتایا گیا ہے ایسے لڑکے کالج میں نہیں آتے۔ جو بڑے بڑے نمبروں پر پاس ہوتے ہوں۔ میں سمجھتا ہوں اگر ہمارے پروفیسر کوشش کریں اور جو اپنا اوقات عرفاً کے ماتحت دینے فرض کی ادائیگی میں پوری طرح منہمک ہو جائیں۔ اور وہ سمجھ لیں کہ تعلیمی طور پر (تربیت تعلیم سے باہر نہیں۔ بلکہ تعلیم کے ساتھ ہی شامل ہے) ہم نے اپنی زندگیاں وقف کر

دی ہیں۔ اور ہمارا مقصد یہ ہے۔ کہ جو لڑکے ہمارے ہاں تعلیم پائیں۔ وہ تعلیم میں دوسروں سے اعلیٰ ہوں وہ تربیت میں دوسروں سے اعلیٰ ہوں۔ وہ اخلاق فاضلہ میں دوسروں سے اعلیٰ ہوں۔ تو یقیناً وہ ان اَن گھڑے جواہرات کو قیمتی ہیروں میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ اخلاص اور تقویٰ اور خدا تعالےٰ کا خوف اپنے دلوں میں پیدا کریں۔ اور لڑکوں کی تعلیمی حالت بھی بہتر بنائیں۔ ان کی

اخلاقی حالت

بھی بہتر بنائیں۔ اور ان کی مذہبی حالت بھی بہتر بنائیں۔ میں اس موقعہ پر اساتذہ اور طلبا دونوں کو یہ نصیحت کرتا ہوں۔ کہ ہمارا مقصد دوسرے کالجوں سے زیادہ بلند اور اعلےٰ ہے۔ کئی باتیں اس قسم کی ہیں جو دوسرے کالجوں میں جائز سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن ہم اپنے کالج میں ان باتوں کی اجازت نہیں دے سکتے۔

طلبا کیلئے ضروری

ہے۔ کہ وہ اپنے افسروں کی کامل اطاعت اور فرمانبرداری کریں۔ اور اساتذہ کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ اپنے افسروں کی کامل اطاعت اور فرمانبرداری کریں اور ان افسروں کا فرض ہے کہ وہ اپنے سے بڑے افسروں کی کامل اطاعت اور فرمانبرداری کریں۔ اگر کسی شخص کو کوئی شکایت پیدا ہو۔ تو

اسلامی طریق کے رُو سے

یہ جائز ہے۔ کہ وہ بالا افسر کے پاس اس معاملہ کو پہنچائے اور حقیقت ظاہر کرے۔ اور اگر وہ افسر توجہ سے کام نہ لے۔ تو اس سے بھی بالا افسر کے پاس اپیل کرے یہ دروازہ ہر شخص کے لئے کھلا ہے۔ اور وہ اس سے

پوری طرح فائدہ

اٹھا سکتا ہے۔ ہمارا یہ طریق نہیں کہ جب تک ایجی ٹیشن نہ ہو۔ ہم کسی کی بات نہیں سنتے۔ ہم صداقت کو ایک ادنیٰ سے ادنیٰ انسان کے منہ سے سن کر بھی قبول کرنے کیلئے تیار ہیں۔ بلکہ صداقت اگر ایک چوہڑے کے منہ سے نکلے تو ہم اس کو بھی ماننے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن اگر صداقت نہ ہو۔ تو خواہ سارا کالج مل کر زور لگائے ہم وہ بات تسلیم کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوں گے۔ پس

یہ روایت ہمارے سکول میں قائم ہے

میں امید کرتا ہوں کہ کالج میں بھی اس کو قائم رکھا جائے گا۔ احمدی طالب علموں کے متعلق تو میں یقین رکھتا ہوں۔ کہ وہ اس پر پوری طرح قائم رہیں گے۔ لیکن چونکہ اس کالج میں دوسرے طالب علم بھی داخل ہوں گے۔ اس لئے میں امید کرتا ہوں۔ کہ ہمارے احمدی طلبا اپنے اثر سے دوسروں کو بھی اس روایت پر قائم رکھنے کی کوشش کریں گے۔ اور کوئی ایسی حرکت نہیں ہونے دیں گے جو کالج کے نظام کے خلاف ہو اور جس سے یہ شبہ پڑتا ہو کہ زور اور طاقت سے

اپنی بات منوانے کی کوشش

کی جا رہی ہے۔ کیونکہ زور اور طاقت سے ماننے کے لئے یہاں کوئی شخص تیار نہیں ہے۔ دنیا میں لوگ زور اور طاقت سے اپنے مطالبات منواتے ہیں مگر وہ اسی وقت منواتے ہیں جب انہیں یقین ہوتا ہے کہ دوسرا فریق زور اور طاقت سے مرعوب ہو جائے گا۔ اگر انہیں یہ یقین نہ ہو تو وہ زور اور طاقت استعمال کرنے کی جرأت بھی نہ کریں۔

واقعہ مشہور ہے

کہ کوئی یتیم لڑکا جس کی ماں چکی پیس پیس کر گذارہ کیا کرتی تھی۔ ایک دن اپنی ماں سے کہنے لگا۔ مجھے دو آنے چاہئیں ماں نے اسے کہا۔ میرے پاس تو صرف ایک آنہ ہے۔ وہ لے لو۔ مگر لڑکا ضد کرنے لگا۔ اور کہنے لگا۔ میں تو دو آنے

ہی کُودوں گا۔ وہ لڑکا اس وقت چھت کی منڈیر پر بیٹھا تھا ماں کو کہنے لگا۔ مجھے دو آنے دو۔ ورنہ میں ابھی چھلانگ لگا کر مر جاؤں گا۔ اس بے چاری کا ایک ہی لڑکا تھا۔ وہ اسے ہاتھ جوڑے۔ منتیں کرے اور بار بار کہے کہ بیٹا ایک آنہ لے لے اس سے زیادہ میرے پاس کچھ نہیں مگر وہ یہی کہتا چلا جائے کہ مجھے دو آنے دے۔ نہیں تو میں ابھی چھلانگ لگاتا ہوں۔ ماں نیچے کھڑی روتی جائے اور بچہ اوپر بیٹھ کر چھلانگ لگانے کی دھمکی دیتا چلا جائے اس وقت اتفاقاً گلی میں سے کوئی زمیندار گذر رہا تھا وہ پہلے تو باتیں سنتا رہا۔ آخر اس نے وہ آلہ جس سے توڑی اٹھائی جاتی ہے اور جسے سانگا کہتے ہیں نکال کر اس لڑکے کے سامنے کیا۔ اور کہا تو اوپر سے آ۔ میں نیچے سے سانگا تیرے پیٹ میں ماروں گا۔ لڑکا یہ سنتے ہی کہنے لگا میں نے چھلانگ تھوڑی لگانی ہے۔ میں تو اپنی ماں کو ڈرا رہا تھا۔ تو

اس قسم کی باتیں

وہیں سنی جاتی ہیں جہاں زور اور طاقت سے دوسرے لوگ مرعوب ہو جاتے ہوں۔ لیکن ہم وہ ہیں جنہیں اسلام نے یہ تعلیم دی ہے۔ کہ صداقت خواہ ایک کمزور سے کمزور انسان کے منہ سے نکلے اُسے قبول کر لو اور صداقت کے خلاف کوئی بات قبول مت کرو۔ چاہے وہ ایک طاقتور کے منہ سے نکل رہی ہو۔ قادیان سے باہر بے شک ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ہمارے سلسلہ کی کسی انسٹی ٹیوٹ میں اس قسم کی باتیں برداشت نہیں کی جا سکتیں پس ہمارے نوجوانوں کو خود بھی احمدیت کے نقش قدم پر چلنا چاہیئے۔ اور دوسرے نوجوانوں پر بھی واضح کرنا چاہیئے کہ یہاں کوئی ایسا طریق برداشت نہیں کیا جا سکتا جو دین کے خلاف ہو۔ اور مذہبی روایات کے منافی ہو۔ ہم نے

یہ کالج دین کی تائید کیلئے بنایا ہے

اگر کسی وقت یہ محسوس ہو کہ یہ کالج بجائے دین کی تائید کرنے کے بے دینی کا ایک ذریعہ ثابت ہو رہا ہے تو ہم ہزار گنا یہ زیادہ بہتر سمجھیں گے کہ اس کالج کو بند کر دیں بجائے اس کے کہ بے دینی اور خلاف مذہب حرکات کو برداشت کریں۔ اس کالج کے پروفیسروں کو بھی

یہ امر تو مد نظر رکھنا چاہیئے

کہ بیرونی دنیا میں عام طور پر صداقت کو اس وقت تک قبول نہیں کیا جاتا جب تک یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کتنے لوگ اسے پیش کر رہے ہیں۔ اگر ایک جتھہ کی طرف سے کوئی بات پیش کی جا رہی ہو۔ تو اُسے مان لیتے ہیں۔ لیکن اگر ایک کمزور انسان کے منہ سے صداقت کی بات نکلے۔ تو اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ ہمیں اس طریق کے خلاف عمل کرنا چاہیئے۔ کہ اگر صداقت صرف ایک لڑکے کے منہ سے نکلتی ہے تو ہم اس بات کا انتظار نہ کریں۔ کہ جب تک سو لڑکا اس کی تائید میں نہیں ہو گا۔ ہم اُسے نہیں مانیں گے۔ بلکہ ہمیں فوراً وہ بات قبول کر لینی چاہیئے۔ کیونکہ صداقت کو قبول کرنے میں ہی برکت ہے اور صداقت کو قبول کرنے سے ہی قومی ترقی ہوتی ہے

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے

کہ ہمارا طریق سارے کا سارا اسلامی ہونا چاہیئے بیشک جب ہندو۔ سکھ۔ عیسائی جو بھی آئیں۔ ہمیں فراخدلی کے ساتھ انہیں خوش آمدید کہنا چاہیئے۔ مگر جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ اُن کے اخلاق سر تا پا مذہب کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ ان کی عادات مذہب کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوں۔ اُن کے افکار مذہب کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ اُن کے خیالات مذہب کے سانچے ہوئے ہوں۔ پس جہاں ہمارے پروفیسروں کا یہ کام ہے۔ کہ وہ تعلیم کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔ وہاں اُن کا ایک یہ کام بھی ہے۔ کہ وہ

رات دن اس کام میں لگے رہیں۔ کہ لڑکوں کے اخلاق اور ان کی عادات اور ان کے خیالات اور ان کے افکار ایسے اعلیٰ ہوں کہ وہ دوسروں کے لئے مذہبی لحاظ سے وہ

ایک مثال اور نمونہ ہوں

اگر خدا تعالیٰ کی توحید کا یقین ہم لڑکوں کے دلوں میں پیدا کرتے ہیں۔ تو ہندوؤں اور سکھوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہندو بھی خدا کے قائل ہیں اور سکھ بھی خدا کے قائل ہیں۔ اگر ہم دہریت کو مٹاتے ہیں۔ اگر ہم خدا تعالیٰ کی ہستی کا یقین لڑکوں کے دلوں میں پیدا کرتے ہیں۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کی محبت کا درس ان کو دیتے ہیں تو ان کے ماں باپ یہ سن کر برا نہیں منائیں گے بلکہ خوش ہوں گے کہ ہمارے لڑکے ایسی جگہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں جہاں دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی مذہبی لحاظ سے بھی تربیت کی جا رہی ہے۔ پس جہاں تک توحید کے قیام کا سوال ہے۔ جہاں تک مذہب کی عظمت کا سوال ہے۔ جہاں تک خدا تعالیٰ کی محبت کا سوال ہے۔ مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی سب اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ ان کو یہ تعلیم دی جائے۔ کیونکہ ان کا اپنا مذہب بھی یہی باتیں سکھاتا ہے۔ میرے نزدیک ہمیں ان باتوں پر اس قدر زور دینا چاہئے کہ ہمارے کالج کا

یہ ایک امتیازی نشان

بن جائے۔ کہ یہاں سے جو طالب علم بھی پڑھ کر نکلتا ہے وہ خدا پر پورا یقین رکھتا ہے۔ وہ اخلاق کی حفاظت کرتا ہے۔ وہ مذہب کی عظمت کا قائل ہوتا ہے۔ اگر ایک ہندو یہاں سے بی اے کی ڈگری لے کر جائے تو اسے بھی خدا تعالیٰ کی ذات پر پورا یقین ہونا چاہئے۔ اگر ایک سکھ یہاں سے بی اے کی ڈگری لے کر جائے تو اسے بھی خدا تعالیٰ کی ذات پر پورا یقین ہونا چاہئے۔ وہ دہریت کے دشمن ہوں وہ اخلاق سوز حرکات کے دشمن ہوں۔ وہ مذہب کو ناقابل عمل قرار دینے والوں کے مخالف ہوں۔ اور ویسے وہ ہر امر سے پوری طرح آزاد ہوں۔ وہ چاہے احمدیت کو مانتے ہوں یا نہ مانتے ہوں۔ مگر

مذہب کی بنیادی باتیں

ان کے دلوں میں ایسی راسخ ہوں کہ ان کو وہ کسی طرح چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ اسی طرح ہمارے کالج کا ایک امتیازی نشان یہ بھی ہونا چاہئے۔ کہ اگر ایک عیسائی یا یہودی اس جگہ تعلیم حاصل کرے تو وہ بھی بعد میں یہ نہ کہے کہ سائنس یا حساب یا فلسفہ کے فلاں اعتراض سے مذہب باطل ثابت ہوتا ہے بلکہ جب بھی کوئی شخص ان علوم کے ذریعہ اس پر کوئی اعتراض کرے۔ وہ فوراً اس کا جواب دے اور کہے۔ میں ایک ایسی جگہ سے پڑھ کر آیا ہوں جہاں دلائل و براہین سے یہ ثابت کیا جاتا ہے۔ کہ اس دنیا کا ایک خدا ہے جو سب پر حکمران ہے۔ میں ایسے اعتراضات کا قائل نہیں ہوں۔

اگر ہم دہریت کی تمام شاخوں کی قطع و برید کر دیں اگر ہم خدا تعالیٰ کی ہستی کا یقین کالج میں تعلیم پانے والے لڑکوں کے دلوں میں اس مضبوطی سے پیدا کر دیں کہ دنیا کا کوئی فلسفہ۔ دنیا کی کوئی سائنس اور دنیا کا کوئی حساب انہیں اس عقیدہ سے منحرف نہ کر سکے۔ تو ہم سمجھیں گے کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ چونکہ اب شام ہو گئی ہے۔ اس لئے میں اب اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں لیکن میں آخر میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ

ہماری نیت یہ ہے

کہ جلد سے جلد اس کالج کو بی اے بلکہ ایم اے تک پہنچا دیں اس لئے کالج کے جو پروفیسر مقرر ہوئے ہیں انہیں اپنی تعلیمی قابلیت کو بھی بڑھانے کا فکر کرنا چاہئے۔ اور آئندہ ضروریات کے لئے انہیں ابھی سے اپنے آپ کو تیار کرنا چاہئے۔ تاکہ جب بڑی کلاسز کھولی جائیں تو قواعد کے لحاظ سے اور ضرورت کے لحاظ سے اور تجربہ کے لحاظ سے وہ اونچی کلاسز

کو تعلیم دینے کے لئے موزوں ہوں اور اس کام کے اہل ہوں - اور چونکہ ہمارا منشاء آگے بڑھنے کا ہے - اس لئے جہاں کالج کے پروفیسروں کو اپنا تعلیمی معیار بلند کرنا چاہیئے - اور اپنے اندر موجودہ قابلیت سے بہت زیادہ قابلیت پیدا کرنی چاہیئے - وہاں انہیں یہ امر بھی مد نظر رکھنا چاہیئے - کہ جب کالج میں وسعت ہو تو جو اچھے اور ہونہار طالب علم ہوں - اور دین کا جوش اپنے اندر رکھتے ہوں - ان کو اس قابل بنائیں - کہ وہ اعلیٰ نمبروں پر پاس ہوں اور ساتھ ہی ان کے

دینی جوش میں ترقی ہو

تاکہ جب وہ تعلیم سے فارغ ہوں تو وہ صرف دنیا کمانے میں ہی نہ لگ جائیں - بلکہ اس کالج میں پروفیسر یا لیکچرار کا کام کر کے سلسلہ کی خدمت کر سکیں - پس ایک طرف وہ اعلیٰ درجہ کے ذہین اور ہوشیار لڑکوں کے متعلق یہ کوشش کریں کہ وہ اچھے نمبروں پر کامیاب ہوں اور دوسری طرف انہیں اس امر کی طرف توجہ دلائیں کہ جب وہ اپنے تعلیمی مقصد کو حاصل کر لیں تو اس کے بعد اپنی محنت اور دماغی کاوش کا بہترین بدلہ بجائے سونے چاندی کی صورت میں حاصل کرنے کے اس رنگ میں حاصل کریں کہ اپنے آپ کو

ملک اور قوم کی خدمت

کے لئے وقف کر دیں - اس کے بغیر کالج کا عملہ مکمل نہیں ہو سکتا - پس ایک طرف ہمارے پروفیسر خود علم بڑھانے کی کوشش کریں اور دوسری طرف آئندہ پروفیسروں کے لئے ابھی سے سامان پیدا کرنے شروع کر دیں - اور نوجوانوں سے کہیں کہ وہ قوم کی خدمت کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں - پھر خواہ انہیں کالج میں رکھ لیا جائے یا سلسلہ کے کسی اور کام پر لگایا جائے بہرحال ان کا وجود مفید ثابت ہو سکتا ہے - سکول میں میں نے دیکھا ہے - جب افسروں کو اس طرف توجہ دلائی گئی تو اس کے بعد ہمیں سکول میں سے ہی ایسے کئی لڑکے مل گئے جنہوں نے اپنی زندگیاں سلسلہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیں

میں امید کرتا ہوں

کہ یہی طریق کالج میں بھی اختیار کیا جائے گا - تاکہ جو طالب علم اس کالج سے تعلیم پا کر نکلیں ان کے متعلق ہمیں کامل یقین ہو کہ وہ تعلیم کے بعد دین کے میدان میں ہی آئیں گے - یہ نہیں ہوگا - کہ دنیا کمانے میں مشغول ہو جائیں اور تاکہ ہم فخر سے کہہ سکیں - کہ ہمارے کالج کا ہر طالب علم اپنے آپ کو دینی خدمت کے لئے پیش کر دیتا ہے - صرف ہمارے بچے ہوئے طالب علم ہی دنیا کی طرف جاتے ہیں کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ خواہ ہم کوئی کام کریں ہماری اصل دوڑ مذہب کی طرف ہی ہونی چاہیئے - اب میں

دُعا کرتا ہُوں

کہ اللہ تعالیٰ ہماری نیک خواہشات کو پورا فرمائے اور یہ بیج جو آج اس مقام پر ہم بو رہے ہیں - اس سے ایک دن ایسا درخت پیدا ہو - جس کی ایک ایک ٹہنی ایک بڑی یونیورسٹی ہو ایک ایک پتہ کالج ہو - اور ایک ایک پھول اشاعت اسلام اور تبلیغ دین کی ایک اعلیٰ درجہ کی بنیاد ہو - جس کے ذریعہ کفر اور بدعت دنیا سے مٹ جائے - اور اسلام اور احمدیت کی صداقت اور خدا تعالیٰ کی ہستی اور اس کی وحدانیت کا یقین لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جائے ۔

اَللّٰھُمَّ آمین

بھی تعلیم دینے کے لئے موزوں ہوں اور اس کام کے اہل ہوں ۔ اور چونکہ ہمارا منشاء آگے بڑھنے کا ہے ۔ اسلئے جہاں کالج کے پروفیسروں کو اپنا تعلیمی معیار بلند کرنا چاہیئے ۔ اور اپنے اندر موجودہ قابلیت سے بہت زیادہ قابلیت پیدا کرنی چاہیئے ۔ وہاں انہیں یہ امر بھی مدنظر رکھنا چاہیئے ۔ کہ جب کالج میں وسعت ہو تو جو اچھے اور ہونہار طالب علم ہوں ۔ اور دین کا جوش اپنے اندر رکھتے ہوں ۔ ان کو اس قابل بنائیں ۔ کہ وہ اعلےٰ نمبروں پر پاس ہوں اور ساتھ ہی ان کے

دینی جوش میں ترقی ہو

تاکہ جب وہ تعلیم سے فارغ ہوں تو وہ صرف دنیا کمانے میں ہی نہ لگ جائیں ۔ بلکہ اس کالج میں پروفیسر یا لیکچرار کا کام کر کے سلسلہ کی خدمت کر سکیں ۔ پس ایک طرف وہ اعلےٰ درجہ کے ذہین اور ہوشیار لڑکوں کے متعلق یہ کوشش کریں کہ وہ اچھے نمبروں پر کامیاب ہوں اور دوسری طرف انہیں اس امر کی طرف توجہ دلائیں کہ جب وہ اپنے تعلیمی مقصد کو حاصل کر لیں تو اس کے بعد اپنی محنت اور دماغی کاوش کا بہترین بدلہ بجائے سونے چاندی کی صورت میں حاصل کرنے کے اس رنگ میں حاصل کریں کہ اپنے آپ کو

ملک اور قوم کی خدمت

کے لئے وقف کر دیں ۔ اس کے بغیر کالج کا مسئلہ مکمل نہیں ہو سکتا ۔ پس ایک طرف ہمارے پروفیسر خود علم بڑھانے کی کوشش کریں اور دوسری طرف آئندہ پروفیسروں کے لئے ابھی سے سامان پیدا کرنے شروع کر دیں ۔ اور نوجوانوں سے کہیں کہ وہ قوم کی خدمت کے لئے اپنی زندگیاں وقف کریں ۔ پھر خواہ انہیں کالج میں رکھ لیا جائے یا سلسلہ کے کسی اور کام پر لگایا جائے بہرحال ان کا وجود مفید ثابت ہو سکتا ہے ۔ سکولوں میں میں نے دیکھا ہے ۔ جب افسروں کو اس طرف توجہ دلائی گئی تو اس کے بعد ہمیں سکولوں میں سے ہی ایسے کئی لڑکے مل گئے جنہوں نے اپنی زندگیاں سلسلہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیں

میں امید کرتا ہوں

کہ یہی طریق کالج میں بھی اختیار کیا جائے گا ۔ تاکہ جو طالب علم اس کالج سے تعلیم پا کر نکلیں ان کے متعلق ہمیں کامل یقین ہو کہ وہ تعلیم کے بعد دین کے میدان میں ہی آئیں گے ۔ یہ نہیں ہوگا ۔ کہ دنیا کمانے میں مشغول ہو جائیں اور تاکہ ہم فخر سے کہہ سکیں ۔ کہ ہمارے کالج کا ہر طالب علم اپنے آپ کو دینی خدمت کے لئے پیش کرتا ہے ۔ صرف ہمارے بچے ہوئے طالب علم ہی دنیا کی طرف جاتے ہیں کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ خواہ ہم کوئی کام کریں ہماری اصل دوڑ مذہب کی طرف ہی ہونی چاہیئے ۔ اب میں

دُعا کرتا ہوں

کہ اللہ تعالےٰ ہماری نیک خواہشات کو پورا فرمائے اور یہ بیج جو آج اس وقت ہم بو رہے ہیں ۔ اس سے ایک دن ایسا درخت پیدا ہو ۔ جس کی ایک ایک ٹہنی ایک بڑی یونیورسٹی ہو ایک ایک پتہ کالج ہو ۔ اور ایک ایک پھول اشاعت اسلام اور تبلیغ دین کی ایک اعلےٰ درجہ کی بنیاد ہو ۔ جس کے ذریعہ کفر و بدعت دنیا سے مٹ جائے ۔ اور اسلام اور احمدیت کی صداقت اور خدا تعالےٰ کی ہستی اور اس کی وحدانیت کا یقین لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جائے ۔

اَللّٰھُمَّ آمین

کلامُ الامامؓ

نونہالانِ جماعت سے خطاب

نونہالانِ جماعت مجھے کچھ کہنا ہے
پر ہے یہ شرط کہ ضائع مرا پیغام نہ ہو
چاہتا ہوں کہ کروں چند نصائح تم کو
تاکہ پھر بعد میں مجھ پر کوئی الزام نہ ہو
جب گذر جائیں گے ہم تم پہ پڑیگا سب بار
سُستیاں ترک کرو طالبِ آرام نہ ہو
خدمتِ دیں کو اِک فضلِ الٰہی جانو
اُس کے بدلے میں کبھی طالبِ انعام نہ ہو
دل میں ہو سوز تو آنکھوں سے رواں ہوں آنسو
تم میں اسلام کا ہو مغز فقط نام نہ ہو
چھوڑ دو حرص کرو زہد و قناعت پیدا
زر نہ محبوب بنے سیمِ دل آرام نہ ہو
رغبتِ دل سے ہو پابندِ نماز و روزہ
نظر انداز کوئی حصۂ احکام نہ ہو
عقل کو دین پہ حاکم نہ بناؤ ہرگز
یہ تو خود اندھی ہے گر نیّرِ الہام نہ ہو
اپنی اس عمر کو اِک نعمتِ عظمیٰ سمجھو
بعد میں تاکہ تمہیں شکوۂ ایام نہ ہو
حُسن ہر رنگ میں اچھا ہے مگر خیال رہے
دانہ سمجھے ہو جسے تم وہ کہیں دام نہ ہو
تم نے دنیا بھی جو کی فتح تو کچھ بھی نہ کیا
نفسِ وحشی و جفا کیش اگر رام نہ ہو
بھولیو مت کہ نزاکت ہے نصیبِ نسواں
مرد وہ ہے جو جفاکش ہو گل اندام نہ ہو
کام مشکل ہے بہت منزلِ مقصود ہے دور
اے مرے اہلِ وفا سُست کبھی گام نہ ہو
ہم تو جس طرح بنے کام کئے جاتے ہیں
آپ کے وقت میں یہ سلسلہ بدنام نہ ہو

میری تو حق میں تمہارے یہ دُعا ہے پیارو
سر پہ اللہ کا سایہ رہے ناکام نہ ہو

ایڈیٹر کے نام

مکرم و محترم جناب ایڈیٹر صاحب "المنار"

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

"المنار" کی اشاعت گذشتہ میں ایک عزیز طالب علم کے تحریر کردہ مضمون "تاثرات" کی چند سطور کے سلسلہ میں بعض گذارشات کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ ان کی اشاعت فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

(بشارت الرحمٰن ایم۔ اے)

ایک مشاعرہ کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے :۔

"اس میں بڑے بڑے شاعر اور متشاعر آئے۔ اور کلام سنایا۔ اس وقت مجھے نہ مشاعرہ سننے کی تمیز تھی نہ شعر سمجھنے کی طاقت لوگ سبحان اللہ۔ ماشاء اللہ۔ واللہ الہام ہے ...... میں نے لوگوں کے تتبع میں "واللہ الہام ہے" کے وزن پر "واللہ کلام ہے" کہہ دیا"

عزیز مذکور میری نگاہ میں ایک سنجیدہ طبع اور دین کی کافی حد تک سمجھ رکھنے والے طالب علم ہیں جو کچھ انہوں نے لکھا ہے۔ اگر وہ قابل اعتراض ہے تو یقیناً یہ غلطی ان سے نادانستہ ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اور کسی جگہ کی تو خبر نہیں۔ لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ ربوہ میں سامعین اشعار کو سن کر "واللہ الہام ہے" جیسا ناپسندیدہ فقرہ چست کرتے ہوں۔ اور اگر کسی بے سمجھ نے ایسا کیا ہے تو اس نے ہمارے نقطۂ نگاہ سے ایک نہایت ہی معیوب حرکت کی ہے۔ اور اپنی مخصوص سوسائٹی کی روایات کی خلاف ورزی کی ہے۔

"الہام" ایک مقدس دینی اصطلاح ہے جو اللہ تعالیٰ کے کلام پر بولا جاتا ہے۔ شاعروں کی نازک خیالیوں کو الہام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ خدا کے بندوں پر بعض اشعار یا اشعار کے مضامین الہاماً بھی نازل ہوئے ہیں اور ہوتے ہیں۔ لیکن عام شعرا کی نازک خیالیوں پر اس مقدس اصطلاح کا استعمال یقیناً دل کو صدمہ پہنچانے والا امر ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے جھوٹ اور مبالغہ سے کام لینے والے شعراء کے متعلق فرمایا ہے کہ وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ کہ غیر حقیقی قسم کی نازک خیالیاں۔ جھوٹ اور مبالغہ آمیزی سے پر کلام کرنے والے شعرا کی پیروی گمراہ لوگ ہی کیا کرتے ہیں۔

حقیقت دراصل یہ ہے کہ اس زمانے کے لوگ خدا تعالیٰ کا کلام سننے سے مایوس ہو چکے ہیں۔ ایک طبقہ ایسا ہے جو انبیاء کی مقدس وحی کو بھی ان کی قدرتی استعداد کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اور ان کے دل سے پھوٹنے والے خیالات پر ہی وحی کے لفظ کا اطلاق کرتا ہے۔ یہ طبقہ اس قسم کے خیالات اس لئے بھی رکھتا ہے۔ کہ سچا الہام پانے والے مردان خدا سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ گذشتہ بزرگوں اور انبیاء کی وحی پر ایک قصہ کہانی کے رنگ میں اعتقاد رکھا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے الہام کا ان لوگوں نے حالی طور پر کوئی تجربہ حاصل نہیں کیا۔ لیکن ربوہ کی سوسائٹی

کے متعلق تو ایسا گمان نہیں کیا جا سکتا۔ ہم تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایک زندہ کلام کرنے والے خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ "الہام" ہمارے نزدیک مقربین الٰہی کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کا انعام ہے۔ اس انعام کو ہمارے زمانے میں بے شمار لوگوں نے حاصل کیا۔ ہم تو ایسے خدا کو ایک منٹ کے لئے بھی ماننے کے لئے تیار نہیں جو اپنے بندوں سے کلام نہیں کرتا۔ اور نہ ان کی راہنمائی کرتا ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کے بچھڑے کو معبود بنانے پر طنزاً فرماتا ہے:۔

اَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّهٗ لَا یُکَلِّمُهُمۡ وَلَا
یَهۡدِیۡهِمۡ سَبِیۡلًا (الاعراف ع ۱۸)

یعنی کیا ان عقل کے اندھوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ بچھڑا معبود کیسے ہو سکتا تھا۔ نہ تو وہ ان سے کوئی معقول کلام کرتا تھا اور نہ ہی انہیں ہدایت کا راستہ دکھاتا تھا۔

ہمارے بانیٔ سلسلہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کس شان سے فرماتے ہیں:۔

رأینا من جلال اللّٰہ شمسًا
فآمنّا وصدّقنا یقینا
شربنا من عیون اللّٰہ ماءً
[illegible] حتی روینا

یعنی ہم نے اللہ تعالیٰ کے جلال سے ایک سورج یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی بصیرت کی آنکھوں سے دیکھا اور ہم دلی یقین سے اس پر ایمان لے آئے۔ اور اس کی تصدیق کی۔ اس کے نتیجہ میں ہم نے اللہ تعالیٰ کے زندگی بخش چشموں سے نکلتی ہوئی ندی کے ذریعہ سے پانی پیا۔ یہاں تک کہ ہم سیراب ہو گئے۔

ہمیں خوب معلوم ہے کہ الہام انسان کے تخیلات کا نام نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے اسی طرح کلام کرتا ہے جس طرح دو دوست گفتگو کرتے ہیں۔ الہام الٰہی بعض دفعہ ایسی زبان میں نازل ہوتا ہے۔ جسے ملہم سمجھتا بھی نہیں اور دوسروں سے اس کا مطلب دریافت کیا جاتا ہے۔ ہمارے آقا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے الہامات میں کئی ایک مثالیں موجود ہیں۔

پس کجا "الہام" کی مقدس اصطلاح اور کجا بیچارے شاعروں کی نازک خیالیاں یہ باتیں تو وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جن کو الہام کی حقیقت کی کچھ بھی خبر نہ ہو اور وہ خدا تعالیٰ کے اس جلیل القدر انعام سے مایوس ہو چکے ہوں۔

اسی طرح "الہام" کے وزن پر "زکام" ہے، کہنا ہمارے نوجوانوں کی شان کے شایاں نہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَمَنۡ یُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا
مِنۡ تَقۡوَی الۡقُلُوۡبِ۔ (الحج ع ۴)

یعنی جو شخص خدا تعالیٰ کے مقدس نشانات اور اصطلاحات اور کلمات کی عظمت کرے گا اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کا یہ عمل دلی تقوےٰ قرار دیا جائے گا۔

پس ہمارے نوجوانوں کو شریعت و طریقت کی مقدس اصطلاحات پر قلم اٹھاتے ہوئے احتیاط سے قدم رکھنا چاہیئے۔ تا ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے شعائر کی بے حرمتی کا الزام ان پر آئے۔

آخر میں پھر اس امر کو واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ معلوم ہوتا ہے عزیزم سے یہ سطور نادانستہ اور سہواً زور قلم میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن ہمارا یعنی اساتذہ کا فرض ہے کہ اپنے عزیزوں کی ہر قدم پر راہنمائی کریں۔

تنقید پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے الزام قائم نہ ہو۔ اور مجھے امید ہے کہ عزیز محترم میری اس تنقید کو اسی رنگ میں لیں گے اور برا نہیں منائیں گے۔ اساتذہ کی طرف سے اگر شاگردوں پر تنقید کی جائے۔ تو اسے سمجھنا اور قبول کرنا ان کی سعادت مندی ہوتی ہے۔

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ
وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ
وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

مکرمی ایڈیٹر صاحب المنار

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں ایک عرصہ سے رسالہ المنار کا مطالعہ کرتا ہوں جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے میرے نزدیک مضامین اور نظمیں سب کی سب جذباتی قسم کے ہوتے ہیں۔ حالانکہ صرف جذباتیت و Sentimentalism تو علم و ادب کا سرمایہ نہیں۔ وہ خیالات جو جذبۂ عمل سے خالی ہوں ہرگز فائدہ مند نہیں ہوتے۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ ایک ذہنی تعیش کہلانے کے مستحق ہیں۔ رسالہ میں وقتاً فوقتاً بعض قابلِ اعتراض مضامین بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً Celebacy اور Origin of Species وغیرہ

مضمون نگار حضرات کو چاہیئے تھا کہ ان موضوعات پر قلم اٹھانے سے پیشتر اسلامی نقطۂ نگاہ کو بھی معلوم کر لیتے۔

تعلیم الاسلام کالج کی غرض عالم باعمل طلبا پیدا کرنا ہے؟ ہمیں اس معیار کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ جو اس عظیم ادارہ کے قیام کی غرض و غایت ہے۔

زیر نظر شمارہ (جنوری سنہ ۱۹۶۰ء) میں صرف محترم مولانا ابو العطاء صاحب کا مضمون مجھے پسند آیا ہے۔ درحقیقت جب تک ہر تعلیمی ادارہ میں جامعہ احمدیہ کی طرح مذہبی ماحول پیدا نہیں کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی خشیت کو قلوب میں جگہ نہیں دی جائے گی۔ تب تک دنیا کبھی بالکل سدھر نہ سکے گی۔ مسلمان عموماً اب یہ سمجھنے لگ گئے ہیں۔ کہ جدید سائنسی علوم حاصل کئے بغیر ہم دوسروں سے بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ لیکن کون کہتا ہے۔ کہ یہ علوم جب کہ بیشتر ان میں سے خود ان کے آباؤ اجداد کی دریافت ہیں حاصل نہ کریں۔ غضب تو یہ ہے کہ یہ بے دین لوگ اسلام کے خوبصورت چہرہ پر "اسلامی ثقافت" کی بدنما پردہ ڈال کر بے دینی اور عیش و عشرت پھیلانا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب یہ علوم اپنی ذات میں برے نہیں۔ بلکہ نہایت ضروری ہیں۔ کیونکہ سائنس خدا کا فعل ہے اور اسلامی تعلیم خدا کا قول۔ اور خدا کے فعل اور قول میں ہرگز تضاد نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ان علوم کو اسلامی رنگ میں رنگین کیا جائے۔

ان حالات میں "المنار" سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ظلمت کی آندھیوں میں نہ صرف خود ایک مضبوط چٹان کی طرح قائم و دائم رہے۔ بلکہ درماندہ مسافروں کو بھی منزل کی نشاندہی کرے۔ والسلام

کیپٹن (ڈاکٹر) محمد رمضان - او - بی - ای
ربوہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بخدمت مکرم ارشد ترمذی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجھے معلوم ہوا ہے کہ المنار کی ادارت آپ کے سپرد کی گئی ہے۔ ہمیں امید واثق ہے کہ آپ المنار کے معیار کو زیادہ سے زیادہ اونچا کرنے کی کوشش کریں گے۔

المنار کا پچھلا شمارہ میری نظر سے گزرا ہے۔ تمام مضامین بہت اچھے تھے۔ لطف الرحمن کے "تاثرات" نے بہت متاثر کیا۔ البتہ حصۂ نظم کی ترتیب میں بعض خاص امور کا خیال نہیں رکھا گیا۔ امام الکلام اور کلام الامام کا مقام ان کے تقدس کے پیش نظر شروع میں ہونا چاہیے تھا۔

آپ کی منظومات دیگر جرائد اور المنار میں پڑھتا رہا ہوں۔ آپ کی تحریر ہر لحاظ سے بہت اچھی ہے۔ اس وجہ سے مجھے امید ہے کہ آپ ایک کامیاب مدیر ثابت ہوں گے۔ والسلام۔

(خاکسار غلام رسول آشنا)

◆

(بقیہ صفحہ [illegible] کا)

تو صبح کی۔ اور مجھے میرے پاس چھوڑ گیا۔ شروع شروع میں میرا ایک دوست رہائش کے مسئلہ سے دوچار تھا۔ ایک احمدی کو پتہ چلا۔ اور اس نے سارا دن مکان کی تلاش میں گزار دیا اور آخر میرے دوست کو مکان ڈھونڈ دیا۔

ربوہ کا مذہبی ماحول بڑا متاثر قسم کا ہے۔ میں نے ربوہ کی مختلف مساجد کو دیکھا۔ مسجد مبارک میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ پھر وہیں مختلف جلسے دیکھے اور لوگوں کے مذہبی شوق کو دیکھ کر اسلام کا ابتدائی سنہری دور آنکھوں میں آگیا۔ کیوں نہ ہو۔ یہ اسی دور کا ہی تو ایک پرتو ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بھی ہے کہ آخر زمانہ میں جب اسلام ثریا پر پہنچ جائے گا۔ تو ایک فارسی الاصل مرد اس کو وہاں سے بھی اتار لائے گا۔

خاص کر کے مجھے اطفال الاحمدیہ کی تحریک اور بچوں کے مذہبی شوق نے بہت حد تک متاثر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چند دن ہوئے ایک زائر نے کہا تھا کہ ربوہ کے بچے بھی فاضل ہیں۔ علاوہ ازیں یہ اس مذہبی ماحول کا ہی نتیجہ ہے۔ کہ ربوہ کے اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والے لوگ نیک با اخلاق اور اچھے شہری ہوتے ہیں۔

عباسیہ اور امیہ دور کے علم و فن کی داستانیں سن رکھی تھیں اور تاریخ میں پڑھا تھا کہ ان دنوں مسلمان علم کی دولت سے مالا مال تھے اور یورپ کے لوگ بھی مسلم یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آتے تھے۔ اب اس نقشہ کو آنکھوں سے دیکھ لیا۔

ربوہ کے تعلیمی اداروں کو دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ اہالیان ربوہ کو درس و تدریس کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔

صبح ہوتے ہی میرے کانوں میں گھنٹیوں کی آواز سنائی دینے لگتی ہے۔ میں یہ تمیز نہیں کر سکتا۔ کہ یہ کس سکول یا ادارے کی گھنٹی ہے۔ پھر اس سے بھی بڑھ کر متاثر کرنے والی بات یہ ہے کہ بلا تمیز عمر اور جنس لوگوں کو تعلیمی اداروں کی طرف بڑھتے دیکھتا ہوں۔ یہ منظر میرے ذہن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان لے آتا ہے۔

"قبر کی دیواروں تک علم حاصل کرو"

حقیقت تو یہ ہے۔ کہ جب میں ربوہ کے نظام کو بحیثیت مجموعی یا نظام کی ایک ایک کڑی کا جائزہ لیتا ہوں۔ تو اس میں درس حیات پاتا ہوں۔ اور کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ "ربوہ کی نئی زمین، نیا آسمان ہے۔ اور نئے ہی اس کے رہنے والے ہیں"

◆

کامیابی:۔ قارئین المنار یہ پڑھ کر خوش ہوں گے کہ ہمارے ایک طالب علم مرزا محمد رفیق (بی۔ اے) نے مضمون نویسی کے ایک مقابلہ میں جو کہ اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام گذشتہ دنوں منعقد ہوا تھا۔ تیسرا انعام حاصل کیا ہے۔ الحمدللہ۔ آپ نے تعمیری توانائی کے موضوع پر قلم اٹھایا تھا۔ اور آپ نے تینوں میں سے [illegible] نمبر حاصل کئے۔ ان کا انعام یافتہ مضمون المنار کی کسی اگلی اشاعت میں شائع کیا جائیگا۔

ادارہ المنار محترم [illegible] حسب سابق طالب علم ہونے کی حیثیت میں دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

ملک منصور احمد عنبر

"اور وہ رخصت ہو گیا"

اس روز بھی عابد اسی کوچہ سے گزرا۔ اور حسب معمول پان والے کی دکان کے سامنے بیٹھے ہوئے ایک اندھے فقیر کی صدا اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"خدا کے نام پر دے جاؤ۔ کچھ دے جاؤ
اے آنکھوں والو! اندھے کی فریاد ہے"

پہلے تو کبھی اس آواز نے عابد کے دل پر اثر نہ کیا تھا کبھی احساس نہ دلایا تھا۔ اس نے کبھی فقیر کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔ لیکن آج وہ اس درد بھری آواز کو نظر انداز نہ کر سکا۔ نہ جانے کیوں ——؟ اور وہ رک گیا۔ ہاتھ جیب میں ڈالا۔ اور فقیر سے ہنستے ہوئے باتیں بھی کرتا رہا۔

"کیا کرو گے بھئی! کچھ لے کر؟"

"کچھ کھا لوں گا۔ کل سے بھوکا ہوں بابو جی! خدا آپ کا بھلا کرے۔"

"بابو جی! اکیلا میں ہی تو نہیں۔ اور بھی تو فقیر بیٹھے ہوتے ہیں۔ کبھی ہماری قسمت بھی جاگ ہی اٹھتی ہے خدا کا شکر ہے بابو جی! آپ جیسے لوگوں کے سہارے ہم بھی زندہ ہیں۔"

عابد بہت دیر تک جیب میں ہاتھ ڈالے کھڑا رہا۔ لیکن بدقسمتی سے اس نے جیب خالی پائی۔ وہ بہت پریشان حالت میں بدنصیب اندھے کی ایک عارضی خوشی کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ اس شرمندگی کے عالم میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ لیکن قدم اس کو اجازت نہ دیتے تھے۔ وہ کھڑا رہا بہت دیر تک کھڑا رہا۔ فقیر سے گفتگو جاری رہی جوں جوں وقت گزرتا جاتا۔ عابد کی بے چینی اور اندھے کے انتظار میں اضافہ ہوتا جاتا۔ عابد اس منظر کو برداشت میں نہ لا سکا اس نے جلدی سے قدم اٹھائے اور گھر کی طرف چل دیا۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کر چکا تو اس کے کانوں نے ایک دھیمی بہت دھیمی آواز سنی۔

"تو آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ بابو جی! مجھے ایک پیسہ ہی دے دیجئے۔"

بدنصیب اندھے نے کوئی جواب نہ پا کر پھر وہی صدا بلند کی۔

"خدا کے نام پر دے جاؤ۔ کچھ دے جاؤ
اے آنکھوں والو! اندھے کی فریاد ہے"

عابد بہت دیر تک اس آواز کو سنتا رہا۔ ہر دفعہ کی آواز اس کے دل پر کانٹے کی طرح چبھتی رہی۔ اس کا دل چھلنی ہو گیا۔ وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے۔ رو دیا بے حد رویا۔ اس کے آنسو تھمنے میں نہ آتے تھے۔ اس کا گھر بہت دور تھا۔ وہ دیر سے گھر پہنچا۔ شام ہو چکی تھی۔ فقیر کی بھوک کے خیال نے اس کی اپنی بھوک کو ختم کر ڈالا۔ اس نے کھانا نہ کھایا۔ واقعہ کو گزرے ایک وقت گزر گیا۔ لیکن اندھے کی صدا اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

"خدا کے نام پر دے جاؤ۔ کچھ دے جاؤ
اے آنکھوں والو! اندھے کی فریاد ہے"

وہ دوسرے روز جب پھر بازار سودا لینے چلا۔ تو فقیر کو ملنے کے لئے بے تاب تھا۔ اس نے دور ہی سے اس کی آواز کو پہچانا۔

"خدا کے نام پر دے جاؤ۔ کچھ دے جاؤ
اے آنکھوں والو! اندھے کی فریاد ہے"

عابد فقیر کے پاس آیا۔ اور رکتے رکتے بات کی۔ "بھئی! تم آواز تو پہچان رہے ہو گے۔ مجھے کل کے واقعہ کا بے حد افسوس ہے۔ بات یہ تھی۔ کہ اس وقت میری جیب خالی تھی۔"

"کوئی بات نہیں باؤجی! ہم غریبوں کا کیا ہے۔ ہمارا آپ پر حق تھوڑا ہی ہے۔ خدا آپ کو بہت دے۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ کل تمہیں کہیں سے روٹی تو مل گئی تھی۔؟"

"نہیں باؤجی! کل تو نہیں۔ البتہ آج کوئی سخی آیا تھا۔ تو روٹی کھا گیا۔"

"ہاں تو تمہارا نام کیا ہے؟"

"جی مجھے نور محمد کہتے ہیں جی!"

"تو کب سے تمہاری آنکھیں خراب ہوئیں۔؟ تم رہتے کس کے پاس ہو۔؟"

"باؤجی! میری آنکھیں تو پیدائش سے ہی خراب ہیں۔ ابھی تین سال کا ہی تھا۔ کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ میری ماں نے محنت مزدوری کر کے مجھے پالا۔ دو سال ہوئے وہ بھی مجھے سولہ سال کا کر کے رخصت ہو گئی تو میں اکیلا ہوں باؤجی!"

"تم تو پھر اپنی ہی عمر کے ہوئے۔ میرے بھی والدین بہن، بھائی اور دیگر تمام رشتہ دار تقسیم ملک کے وقت مجھ سے بچھڑ گئے۔ اب ایک وکیل صاحب کے گھر نوکر ہوں بازار سے سودا سلف لے جاتا ہوں اور بچوں کو کھلاتا ہوں پندرہ روپے ماہانہ مل جاتے ہیں۔ روٹی کپڑا تو وکیل صاحب کے ہی سپرد ہے۔ اس لئے دس روپے بچا لیا کرتا ہوں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ تو یہ لو کچھ پیسے ہیں روٹی کھا لینا۔"

"آپ نے بہت زیادہ تکلیف کی باؤجی! خدا آپ کا بھلا کرے۔"

باؤجی کیسے ——؟ غریب آدمی ہوں۔ سارا مہینہ کام کرتا ہوں۔ تو کہیں پندرہ روپے ملتے ہیں۔"

"ہماری نظروں میں تو آپ امیر ہی ہیں"

"کیا نہیں ———؟ باؤجی!"

"نہیں! —— تمہاری نظر میں کونسی بھلا —— ؟ نظر آتا ہے —— کیا —— ؟"

"کوئی بات نہیں باؤجی! ایسے بھی تو زندگی گذر ہی رہی ہے۔"

"تو کیا تمہاری آنکھیں ٹھیک نہیں ہو سکتیں —؟"

"پیسوں سے کیا کام نہیں ہو سکتا۔ باؤجی! ایک ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کیا تھا وہ تو "اتنا" بتاتے ہیں۔"

یہ سُن کر عابد غائب ہو جاتا ہے۔ اور گہرے خیالوں میں کھو جاتا ہے۔ کہ:—

"اس بیچارے کو بھی تو شوق ہوگا۔ کہ دنیا کی چیزیں دیکھوں۔ وہ سوچتا ہوگا۔ کہ میں جس شخص سے بات کر رہا ہوں۔ اس کی شکل کیسی ہوگی۔ اس کی آواز پہچانتا ہوں۔ اس کے ہونٹ بھی تو دیکھوں۔ اس کے قدموں کی آہٹ سنتا ہوں۔ اس کی چال بھی تو دیکھوں۔ وہ سورج، چاند، ستارے، بادل، پہاڑ وغیرہ دیکھنا چاہتا ہوگا۔ ضرور چاہتا ہوگا۔ وہ کتنا بے چین سا ہوگا۔ ہائے وہ اندھیرے میں گھبرا بھی تو جاتا ہوگا۔ وہ تنہائی میں روتا بھی ہوگا۔"

تو اگلے روز عابد اپنی چھ سال کی جمع کی ہوئی کمائی اندھے کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہتا ہے:—

"یہ حقیر تحفہ ہے —— اگر تمہارے کام آسکے تو۔"

فقیر نے عابد کا ہاتھ پکڑا۔ اور پیسے لینے سے بہتیرا انکار کیا۔ کہ:—

"یوں بھی تو زندگی گذر ہی جائے گی۔ باؤجی! آپ کیوں بھلا اتنے پیسے ضائع کرتے ہیں۔"

لیکن عابد نہ مانا۔ اور اندھے کا علاج شروع ہو گیا۔ عابد روزانہ ہسپتال میں اس کے پاس جاتا۔ اور میٹھی میٹھی

باتوں سے اس کا دل بہلاتا۔

"تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ تو میرا ابھی کوئی غم خوار تو ہوگا باقی زندگی اچھی گزر جائے گی۔ تم مجھے بھائیوں سے زیادہ عزیز ہو۔"

"ہاں عابد! تم کتنے اچھے ہو۔ تم نے راستہ پر پڑے ہوئے ایک ننگے کو اٹھا لیا تم نے ایک راہی کی مدد کی۔ تم نے مجھے اپنا لیا۔ تم نے میری زندگی کو اپنی زندگی پر ترجیح دی۔ سوچتا ہوں کہ اس کا بدلہ کیسے اتاروں گا۔ افسوس کہ مجھ میں طاقت نہیں صحت نہیں لیکن تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔"

اندھے کی آنکھیں ٹھیک ہونے میں ابھی چند روز ہی باقی تھے۔ کہ وکیل صاحب کو تمام بال بچوں سمیت کسی مجبوری کی بناء پر کوئی سفر پیش آ گیا۔ عابد کو بھی ساتھ جانا پڑا۔ قسمت کا کرنا یوں ہوا۔ کہ جہاز کو آگ لگ گئی۔ اور اکثر مسافر جل کر راکھ ہو گئے۔ دو تین بچے جو بہت بری طرح زخمی ہوئے۔ ان میں عابد بھی شامل تھا۔ اس کی ٹانگ کٹ گئی۔ قریب کے ہسپتال میں کئی ماہ تک داخل رہا۔ ایک چھڑی کے سہارے سے چلتا۔ کوئی کام کرنے سے معذور ہو گیا۔ اس کو پہلے اندھے کی یاد ستاتی۔ وہ اسی ہسپتال میں پہنچا۔ اندھا تو اب ٹھیک ہو کر وہاں سے جا چکا تھا۔ اور عابد کی انتہائی تلاش میں تھا۔ عابد نے بھی اسکی تلاش شروع کر دی لیکن کئی سال گزر گئے یہ دونوں بچھڑے ہوئے ساتھی پھر نہ مل سکے آخر مجبور ہو کر اسی پان والے کی دکان کے سامنے عابد روزانہ بیٹھ جاتا اور صدا لگایا کرتا۔ "خدا کے نام پر بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔ اے دنیا والو! ایک معذور کی فریاد ہے" وقت گزرتا گیا۔ بچھڑے ہوئے ساتھی بچھڑے رہے آخر ایک روز اسی جگہ سے قسمت کا راہی گزر رہا تھا۔ اور اسکے کانوں نے ایک جانی پہچانی آواز سنی اسکو عابد کی ہی تلاش تھی لیکن وہ اسکو نہ پہچان سکا لنگڑے کے پاس آیا اور ایک پیسہ اسکی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ عابد نے تو اس کو پہچان لیا لیکن صرف کہا: "خدا آپ کا بھلا کرے بابو جی!"

مرسلہ محمد جمیل لطیف

پارہ ہائے دانش

در کوئے تو اگر سرِ عشاق را زنند
اول کسے کہ لافِ تعشق زند منم

(حضرت مسیح موعود علیہ السلام)

بہ وفائے تو کہ گر خشت زنند از گلِ من
ہمچناں در دلِ من مہر و وفائے تو بود

(سعدی رح)

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

بلبم رسیدہ جانم بیا کہ زندہ مانم
پس ازاں کہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

ہر دو عالم قیمتِ خود گفتۂ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

(امیر خسرو دہلوی)

نظیری زندگی در دردِ دل جو
کہ دردِ تو مسیحائے تو باشد

سمیر احمد خان شمیم
سال اوّل (بی۔ اے)

زکام

(زکام سے معذرت کے ساتھ)

عالم نو آفات کی جملہ آفات سے لقمان حکیم بھی واقفیت پیدا نہ کر سکے ہوں گے۔ مگر تجربہ شاہد ہے کہ زکام علیہ العلیہ سے نہ صرف وہ واقف ہی ہوں گے۔ بلکہ متعدد مرتبہ ان کو ہوا بھی ہوگا۔

اشرف المخلوقات حضرت انسان یعنی تا پیدائش زندگی بھر ہزار پرہیز اور ہزار احتیاط کے باوجود زکام سے ضرور ملاقات کرتا ہے۔ آپ کیسے ہی بد ذوق کیوں نہ ہوں حضرت زکام سال میں چند بار مزاج پرسی کے لئے بغیر اجازت ہی شرف قدم بوسی کے لئے حاضر خدمت ہو کر آپ کے سر پر سوار ہو بیٹھیں گے۔ اب آپ ہزار ڈاکٹروں سے سفارش کرائیں، حکما کے تیر بہدف نسخے استعمال کریں یا ہومیو پیتھک ادویات سے ان کی خاطر مدارات کریں۔ یہ "مان نہ مان میں تیرا مہمان" بن کر آپ سے جدائی گوارا نہ کریں گے۔ اس معاملہ میں ان کی ہٹ دھرمی کو ہم حکیم بھی مان چکے ہیں۔

زکام کیوں ہوتا ہے۔ کہاں ہوتا ہے۔ کب ہوتا ہے۔ اور کیسے ہوتا ہے۔ اس بات کے لئے آپ دوا خانہ "خدمت خلق" "خورشید یونانی دوا خانہ" "ناصر دوا خانہ" "نادر دوا خانہ" "رحمت دوا خانہ" "راجہ ہومیو اینڈ کمپنی" اور اگر موقع ملے تو "ہمدرد دوا خانہ" کے ماہرین کی طرف رجوع کریں۔ ورنہ فضل عمر ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ تو دور نہیں ہیں۔

ہاں! اگر آپ زکام کی مستند تعریفوں سے متعارف ہونا چاہتے ہیں تو آئیے! آئیے نا! ابھی گھبراہٹ کیسی؟ ابھی تو تیار ہو جائیے۔ "پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی"۔

تعریف و تعارف:۔ زکام وہ زمانہ ہے۔ جس میں کسی شخص کی ناک کا بہنا، ناک کا بند ہونا یا چھینکوں کا آنا بکثرت پایا جائے جیسے منہ کھول کر سانس لینا، سٹر سٹر کرنا، اچھیں اچھیں کرنا (چھینکیں مارنا) وغیرہ

زکام کی اقسام:۔ جناب زکام سے واقفیت کے بعد لگے ہاتھوں ان کے دیگر لواحقین سے بھی علیک سلیک کر لیجئے

زکام کے لواحقین معنوی لحاظ سے اور غیر منطقی طریقہ سے تعداد میں پانچ ہیں۔ اگر کسی صاحب کو اعتراض ہو تو اس تعداد میں ہم کمی بیشی بھی کر سکتے ہیں۔

لواحقین:۔ (۱) خشک زکام (۲) تر زکام (۳) عادی زکام (۴) شوقیہ زکام (۵) مینڈکی کا زکام۔

(۱) **خشک زکام**:۔ خشک زکام ایسا ہے جو حامل زکام کے لئے "المیہ" ٹریجیڈی اور لواحقین کے لئے "طربیہ" کامیڈی ہوا کرتا ہے۔ ناممکن ہے کہ حامل زکام ہذا کو دیکھ کر آپ کے چہرہ مبارک پر ہنسی کی لہر نہ دوڑ جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ اس ہنسی کو رسمی ہمدردی میں تبدیل کر کے کھانسنے کی کوشش کریں۔ سانس لینے میں سخت دقت ہوتی ہے۔ سانس کی ضرورت باقی ہے۔ مگر کس طرح؟ دہن مبارک وا، ایک انچ! اجی نہیں تین انچ پھیلا ہوا۔ جس سے اندر دانت مع حلقوم کے نمایاں اور گاہے گاہے سانس لینے کی آواز اس طرح آتی ہے جیسے "گورنمنٹ بس" کا ڈیزل انجن سٹارٹ ہو رہا ہے۔

(۲) **تر زکام**:- یہ زکام کچھ زیادہ ہی حوصلہ مند واقع ہوا ہے۔ یہ باقاعدہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ آپ کسی زکامی کو باتیں کرتے ہوئے دیکھیں۔ اچھے خاصے بات چیت کر رہے ہوں گے۔ مگر مدِ مقابل یہ ضرور غور کرنے لگے گا کہ یہ ششڑ ششڑ کی آواز کہاں سے پیدا ہو رہی ہے۔ مگر ذرا غور کرنے سے یہ مسئلہ فوراً حل ہو جائے گا۔ اگر آپ اب بھی نہ سمجھے ہوں تو آئیے ہم آپ کو سمجھائیں۔ کیونکہ بڑے لوگوں کا قول ہے کہ مثال آدمی کی سمجھ میں جلد از جلد گھس جاتی ہے

”گر قبول افتد ......“

زکام ہذا کی مثال دریائے چناب سے دی جا سکتی ہے جس طرح دریائے چناب سیلاب کے دنوں میں لفِ پریشان کی مانند بل کھا کر بہتا ہے۔ بعینہٖ جناب زکام تر مبتلائے زکام کے دونوں نتھنوں سے نیچے بہتا ہے۔ پھر جس طرح دریائی سیلاب سے کئی گاؤں متاثر ہوتے ہیں اسی طرح تر زکام سے متعلقہ مونچھ پور۔ حلقہ ذہن نگری۔ اور حلقہ ریش آباد متاثرہ علاقے کہلاتے ہیں۔ متاثرہ علاقوں کی دیکھ بھال کے لئے بعض دفعہ پیسے خرچ کر کے یا اکثر دفعہ عارضی رومال سے ناک کے آگے بند باندھ کر ناک بذریعہ سانس اوپر کھینچا جاتا ہے

(۳) **عادی زکام**:- یہ اپنی تعریف آپ ہی ہے

”وہ جو کچھ بھی ہیں خدا کی قسم لاجواب ہیں“

واللہ بڑے ہی باذوق ہیں۔ تمہیں کبھی ایسے زکامی سے ملاقات کا موقع میسر آیا ہو گا۔ اگر نہیں تو آپ آدمی نہیں بلکہ فرشتے ہیں۔

عادی زکام نہ تو زکام تر کی طرح بہتا ہے اور نہ ہی خشک زکام کی مانند رکا رہتا ہے۔ بلکہ ان دونوں زکاموں کے بین بین اس کا مقام ہے۔ نیم حکیم اور نئے طبیب اس بات پر متفق ہیں۔ کہ حضرتِ زکام علیہ ما علیہ جب روٹھ جاتے ہیں یا بگڑ جاتے ہیں تو انتقاماً اپنی یہ صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ سنا گیا ہے کہ حاملِ زکام ہذا کا ستارہ گردش میں ہوتا ہے۔ بار بار ناک کے بند ہونے اور پھر زور لگا کر اس کو کھولنے میں بڑی موسیقانہ آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔

(۴) **شوقیہ زکام**:- زکام کی یہ قسم بڑی فائدہ مند ثابت ہو چکی ہے۔ آپ بھی شوق سے اس نسخہ کو آزمائیں۔ زکام کو پیدا کرنے کی اصل اور صحیح غرض تو خدا تعالیٰ کے نزدیک غالباً یہی ہوگی۔ کہ اس اشرف المخلوقات کی چھوٹی چھوٹی۔ ادنیٰ ادنیٰ اور معمولی معمولی غلطیوں اور برائیوں کا بدلہ بجائے عالمِ آخرت میں دینے کے اسی دنیائے فانی میں منجملہ دیگر صورتوں کے زکام کی صورت میں لے لیا جائے مگر اس دور کی اشرف المخلوقات نے زکام کے نامِ نامی کو اپنی اغراض کیلئے بڑے عمدہ طریقہ پر استعمال کر کے اس ضمن میں حسبِ عادت بیجا تصرف کیا ہے۔

جب چھٹی لینے کے لئے کوئی معقول بہانہ ہاتھ نہ لگے تو زکام کی سفارشات حاصل کی جاتی ہیں۔ جو [illegible] نتھنوں میں لگانے سے حاصل ہو سکتی ہیں۔

(۵) **مینڈکی کا زکام**:- یہ زکام بڑا ظریفانہ زکام ہے۔ ادیب لوگ اکثر اپنے محاوروں میں استعمال کرتے ہیں۔

نمبر ۱:- یہ اکثر بے تکے ناہموار بجتا ہوا۔ اوٹ پٹانگ۔ نااہل اور نکمے لوگوں کو ہوتا ہے۔ جو غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں۔

نمبر ۲:- یہ زکام اکثر ان طلباء کے سر ہوتا ہے جو امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد مجسم شتر بن کر اپنی سر اور گردن کو اونچا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو الیکشن سے پیشتر سر جھکائے اساتذہ کے سامنے [illegible] کمان کی مانند جھکے ہوتے ہیں بلکہ مجسم کمان بنے رہتے ہیں۔ اور پھر کامیابی کے بعد انہیں راستے میں دوستوں کے ساتھ سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ تو کہنا پڑتا ہے کہ ”مینڈکی کو زکام ہو گیا“ ہے ...... چھیں چھیں ....

صاحب ...... مرغ ...... چھیں۔ چھیں۔ چھیں ....

رخصت ...... چھیں ..... چاہتا ہوں ؟

رشید احمد جاوید

مُباحثہ کی رُوح

حکومت کے نئے کرنسی سسٹم پر یونائیٹڈ بیکرز ایسوسی ایشن کی گرما گرم بحث

۔۔ —— دریا کے اس پار — پہاڑی کی اوٹ میں — ایک جدید طرز کی جھونپڑی نظر آ رہی ہے۔ یہ جھونپڑی مثال ہی ہیں "یونائیٹڈ بیکرز ایسوسی ایشن" (U.B.A.) نے "اپنی مدد آپ" اور "تعاون باہمی" کے زریں اصولوں پر کاربند ہو کر تعمیر کی ہے۔ جھونپڑی کی جائے وقوع اتنی پرکشش انتہائی کیف آور ہے کہ اگر حکومت کو علم ہو جائے۔ تو بلا تاخیر "پارلیمنٹ ہاؤس" کی تعمیر کے لئے "ٹینڈر مطلوب ہیں" کے اشتہار اخباروں میں نکلنے لگیں — آئیے آپ کو ذرا اس جھونپڑی تک لے چلیں۔ اس وقت یہاں ایک نہایت ہی اہم میٹنگ منعقد ہونے والی ہے — لیجئے یہ رہی آپکی "جھونپڑی" — لیکن — داخلہ محدود — یو۔ بی۔ اے کا مصدقہ رکنیت فارم دکھانا لازمی ہے!

دیکھئے، پیچھے سے جھونپڑی کے عقب میں بیٹھ جاتے ہیں۔ آواز تو مائک سے آ ہی جائے گی۔ اور یہ لو — ٹن، ٹن، ٹن — ٹن، ٹن، ٹن — شام کے چھ بجے ہیں — ایسوسی ایشن کے پریذیڈنٹ جناب پیٹ خان تھیلی کی تشریف آوری پر جملہ حاضرین احتراماً کھڑے ہو گئے ہیں۔ سیکرٹری صاحب نے فوراً آپ پریذیڈنٹ صاحب سے درخواست کی ہے کہ وہ کرسئ صدارت پر رونق افروز ہو کر آج کے مباحثہ کی ابتدا فرمائیں — پریذیڈنٹ صاحب کرسئ صدارت سنبھالنے کے بعد حاضرین سے مخاطب ہوتے ہیں:-

حاضرین مجلس!! آج جس مسئلہ پر ہم نے بحث کرنی ہے وہ یہ ہے کہ

"حکومت نے جو نیا کرنسی سسٹم جاری کیا ہے اور جس کی رو سے روپیہ کو سو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اس کے گداگر طبقہ پر کیا اثرات پڑ سکتے ہیں؟"

"اس مسئلہ کا پس منظر یہ ہے کہ جب سے پاکستان معرض وجود میں آیا۔ روپیہ کے ۱۶ آنے اور ۶۴ پیسے ہوتے تھے۔ لیکن اب حکومت نے اس نظام کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ حکومت کے کارناموں میں سے یہ ایک اہم کارنامہ ہے۔ نئے سسٹم کے مطابق ایک روپیہ اب چونسٹھ کی بجائے سو پیسوں کا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ موجودہ پیسہ کی "قدر" پہلے پیسہ سے کم ہے۔ پرانے اور نئے پیسے میں "قدر" کے لحاظ سے ۳ : ۵ کی نسبت ہے یعنی نئے پانچ پیسے پرانے تین پیسوں کے برابر ہوں گے۔ نئے سسٹم کے اجراء کا مقصد حساب میں آسانی پیدا کرنا اور وقت میں کفایت کرنا ہے۔۔۔ میں نے آپ کے سامنے قدیم و جدید کرنسی سسٹم کا مختصر سا خاکہ پیش کر دیا ہے

اب آپ لوگوں کو اپنی رائے دینے کا موقع دینا چاہیئے۔ اس وقت یہاں تین پارٹیوں کے نمائندگان تشریف فرما ہیں سب سے پہلے کنزرویٹو پارٹی کے چیئرمین اظہارِ خیال فرمائیں گے۔ پھر لیبر پارٹی'' کا نمائندہ اپنا زاویہ نگاہ بیان کریگا اور بالآخر "لبرل پارٹی" کے مشیر اقتصادیات آپ سے مخاطب ہوں گے۔ اب میں "کنزرویٹو پارٹی" کے چیئرمین جناب چپاتی لی کھنو صاحب سے گذارش کرتا ہوں کہ وہ تشریف لاکر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں"

مباحثہ کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ اس وقت جناب چپاتی لی کھنو آپ سے مخاطب ہیں:-

"معزز سامعین! جیسا کہ عزت مآب صدرِ مجلس نے ارشاد فرمایا ہے۔ آج کے مباحثہ کا مرکزی نقطہ "نئے کرنسی سسٹم کا اثر گداگروں پر" ہے۔

حضرات! جہاں تک میری نظرِ غائر اور گہرائی بصیرت نے کام کیا ہے۔ پرانے کرنسی سسٹم کو تبدیل کرنے کی کوئی کافی اور معقول وجہ میرے ذہن میں نہیں آتی۔ نئے سسٹم کا پہلا فائدہ یا اس کے اجراء کیلئے پہلی وجہ جواز یہ بیان کی گئی ہے کہ اس سے حساب کتاب میں "آسانی" پیدا ہو جائیگی میں کہتا ہوں کہ یہ کوئی فائدہ نہیں۔ وقتی "آسانی" سے قوم کے اندر سستی، کاہلی اور لاپرواہی جڑ پکڑے گی۔ جس کو کسی صورت میں بھی فائدہ نہیں کہا جا سکتا۔ لاریب سستی اور کاہلی بجائے خود "آسانی" کی ہی پیداوار ہیں۔ خود "ہمارا" وجود بھی اسی امر کی تصدیق اور توثیق کرتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ ایسا کرنے سے حساب کتاب میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔ قوم کی فعال قوت کو کچلنے کے مترادف ہے۔

دوسرا فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے وقت میں کفایت ہوگی۔ چلو مانا۔ وقت میں کفایت ہوگئی۔ مگر اس کا دوسری طرف مطلب یہ ہوگا، کہ قوم کے دماغ مشکل مسئلوں کو حل کرنے کی اہلیت و قابلیت سے محروم ہوکر رہ جائیں گے قوم کو ضرورت ہے اس وقت مفکروں کی، سائنسدانوں کی نہ کہ تن آسانوں کی۔ اس لئے وقت کی اس کفایت کا کیا فائدہ جو قوم کے دماغوں پر تالے لگا کر رکھ دے۔

ہر چند کہ مجھے ان مزعومہ فوائد کے غلط ثابت کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر میں نے یہ اس لئے کیا ہے تا معلوم ہو کہ حقیقتاً یہ کوئی فوائد نہیں۔

حکومت آئے روز براہِ راست ہمارے خلاف قوانین پاس کرتی رہتی ہے مگر اب جب کہ براہِ راست قوانین کے نفاذ میں قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہیں ہوتی تو بالواسطہ کوششیں شروع ہوگئی ہیں۔ میں ابھی آپ کو بتاتا ہوں کہ "نیا کرنسی سسٹم" کس طرح ہمارے لئے سمِ قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ ۔۔۔۔ غور سے سُنیئے ۔۔۔۔۔۔

پہلے روپے میں ۱۹۲ پیسے تھے۔ اب سو پیسے کر دیئے گئے ہیں۔ میری دلیل یہ ہے کہ اس تبدیلی کے بعد ہماری آمدنی کافی حد تک کم ہو کر رہ گئی ہے "گداگر نیوز" کی ہی مثال لے لیجئے۔ یہاں ایک بازار ہے جس میں نقشہ [illegible] بیٹھے ہیں۔ جب قدیم نظام

رائج تھا۔ میں صبح سات بجے بازار کا ایک چکر لگا کر ساڑھے سات بجے ڈیڑھ روپیہ کما کر گھر واپس آجاتا۔ لیکن اب یہ حال ہے۔ کہ آمدنی پہلے کی نسبت دو تہائی رہ گئی ہے۔ پیسے تو مجھے اب بھی سو ملتے ہیں۔ مگر ان کی "قدر" صرف ایک روپیہ کے برابر ہے جبکہ اتنی ہی تعداد کے پیسے پہلے ڈیڑھ روپے سے بھی زائد بن جاتے تھے۔ مصارف زندگی میں تو روز بروز بڑھ رہے ہیں۔ اب ناچار مجھے پانچ میل کا سفر کر کے "نیتراں والی" جانا پڑتا ہے۔ یہاں ڈیڑھ سو دکانیں ہیں۔ مگر "قانون تقلیل حاصل" کے تحت یہاں کے حالات میری کمائی میں ۲۵ نئے پیسوں سے زیادہ اضافہ نہیں کرسکتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا۔ کہ اس قدر تگ و دو کے بعد بھی صرف سوا روپیہ مل جاتا۔ یعنی میری "پہلی کمائی" سے چار آنے کم۔ دن ڈھلے میں "ہیگر ٹاؤن" کی راہ لیتا ہوں۔ یہ انگریزی طرز کا ایک صنعتی قصبہ ہے۔ مگر یہاں پہنچتے پہنچتے شام ہونے کو ہوتی ہے۔ تمام دن کی مصروفیات کے بعد سرمایہ دار "کل" کی فکر میں پریشان و سرگرداں نظر آتے ہیں بھلا ان سے سوال کرنے کی جرأت کون کرے پھرتے پھرتے صرف دو چند دکانوں پر صدا دے کر چلتا بنتا ہوں۔ مگر یقین مانئے کہ اس اچھے۔ مجھے اس قصبہ سے صرف ۱۲ نئے پیسے ہاتھ لگتے ہیں۔ پورے بارہ گھنٹے کے چکر کے بعد عین مغرب کے وقت گھر پہنچتا ہوں۔ تو اس قدر تھکا ہوا ہوتا ہوں۔ کہ نماز بھی بھول جاتی ہے۔ اس مختصر سی تقریر کے بعد آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ کہ حکومت نے جو دو بڑے فائدے موجودہ سسٹم کے گنوائے ہیں یعنی "آسانی" اور "کفایت وقت" وہ کسی حد تک درست نہیں۔ میری داستان سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ نہ تو ہمیں کوئی "آسانی" پیدا ہوئی ہے اور نہ ہی وقت میں کفایت ہوئی ہے۔ میری اس قابل رحم حالت کے بیان کے بعد یہ بات بپایہ ثبوت پہنچ جاتی ہے کہ کس قدر بالواسطہ حکومت گداگروں کی سرگرمیوں کی حوصلہ شکنی کر رہی ہے۔ ایک طرف ان کی مالی حالت کمزور ہو گئی ہے۔ بیچارے تمام دن مارے مارے پھرتے ہیں مگر پھر بھی پہلی اور موجودہ آمدنی میں اتنا تفاوت رہ جاتا ہے کہ خیال کرتے ہی لقمہ منہ سے زمین پر آرہتا ہے۔ دوسری طرف مصارف زندگی میں بدستور اضافہ کی طرف رجحان ہے۔ ان حالات میں آپ بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آنے والے چند سالوں میں ہمارے مشن کو کس قدر تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ گری ہوئی آمدنیوں سے معاشی اصول کے مطابق ہر سال ہمارا معیار زندگی پست سے پست تر ہوتا چلا جائے گا۔

پس اے میرے بھائیو! اور میرے دوستو! آؤ ہم سب مل کر اتفاق اور اتحاد کے ساتھ گورنمنٹ کے ارباب حل و عقد کے سامنے رو دیں۔ کہ ہمارے حال پر رحم کیا جائے اور ہمارے مقدس مشن میں رخنہ اندازی نہ کی جائے۔ کیوں کہ

تونگروں کا ایک مخصوص طبقہ ہے۔ اور لاریب وہ "کام چوری" ان کے مشن کا مرکزی نقطہ ہے۔ لیکن بایں ہمہ حکومت کو یہ حق نہیں پہنچتا۔ کہ وہ کسی طبقہ کے مرکزی نقطہ میں تبدیلی کر کے اس کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کی مرتکب ہو۔ میرے خیال میں ہمیں گورنمنٹ سے یہ درخواست کرنی چاہیئے۔ کہ وہ روپیہ کو ٹشو ایسے حصوں میں تقسیم کر دے۔ جس سے ملک کا ہر طبقہ یکساں فائدہ اٹھا سکے۔ مثلاً اگر روپیہ کے ہر حصہ کی قدر پرانے ڈیڑھ پیسہ یا دو پیسہ کے برابر ہو تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس سے ملک کے ہر مکتب فکر کو یکساں فائدہ ہوگا۔ شکریہ!"

جناب نکھٹو صاحب کی تقریر ختم ہوتی ہے۔ صدر محترم کے ریمارکس سنیئے:-

"کنزرویٹو پارٹی کے چیئرمین نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ اس قدر درست، واضح اور جامع ہیں کہ ان کے بعد کسی مزید تقریر کی ضرورت نہیں رہتی۔ تاہم انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ باقی دو پارٹیوں کے نمائندگان کو بھی بولنے کا موقع دیا جائے۔

چنانچہ اب میں "لیبر پارٹی" کے سکرٹری و ممبر جناب کام چور صاحب فرار کی خدمت میں گزارش کرتا ہوں کہ وہ ہم کو اپنے خیالات سے مستفید فرمائیں۔"

اس وقت جناب فرار صاحب آپ سے مخاطب ہیں:-

"مسئلہ زیر بحث کا پس منظر تو پہلے ہی بیان ہو چکا ہے۔ اعادہ غیر ضروری ہے۔ تاہم "لیبر پارٹی" کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ مزدور کی ایک بنیادی ضرورت کی تشریح کر دوں۔ وہ بنیادی ضرورت عدم حصول روزگار ہے۔ عدم روزگار یا بیروزگاری اس کیلئے موت کا پیغام ہے۔ آج کی بحث میں اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے مجھے بیروزگاری کے اس بنیادی عنصر کو خصوصی طور پر ذہن میں رکھنا ہوگا۔ بصورت دیگر ہم اپنے اساسی مقاصد سے بہت دُور جا پڑیں گے جس کو کسی قیمت پر بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔

حضرات! میرے نزدیک نئی کرنسی کی پالیسی گورنمنٹ کا ایک نہایت مستحسن قدم ہے۔ اس قابل ہے کہ اس کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے۔ اور تشکر و امتنان کے جذبات سے اس کا استقبال کیا جائے۔ پس ہمارا فرض ہے کہ ہم اس پالیسی کا گرمجوشی سے خیر مقدم کریں۔ حکومت کا یہ کارنامہ ہمیشہ سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ گورنمنٹ نے نئی کرنسی سسٹم کے جو دو فائدے بیان کئے ہیں۔ وہ بالکل درست اور دُور رس نتائج کے حامل ہیں۔ ہماری پارٹی کا مرکز وہ بیکار پور ہے وہاں ہماری پارٹی کے کوئی ڈنشو کے قریب اراکین سکونت پذیر ہیں۔ یکم جنوری ۱۹۶۲ء سے پہلے ان ڈنسو میں سے تقریباً بیشتر برسرروزگار تھے۔ وہ بھی تمام دن ٹانگیں مارتے تھے اور شام نہ معلوم کن کن تکالیف کو برداشت کرنے کے بعد مشکل ایک روپیہ کی کمائی کر جاتے تھے۔ اب یہ حالت ہے کہ ڈنسو میں سے پونے ڈنسو پورے طور پر بیروزگار ہو گئے ہیں اور بقیہ کے لئے حالات امید افزا ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی اوسط کمائی پندرہ آنے کے قریب فی کس بنتی ہے اور پرانے برسرروزگار مزدوروں کو کچھ نقصان بھی ہوا ہے۔ لیکن یہ نقصان اتنا کم ہے کہ ذرہ سی اہمیت دیئے بغیر نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف مزدوروں کو بحیثیت جماعت فائدہ پہنچا ہے۔ اب ان کی غالب اکثریت برسرروزگار ہو چکی ہے!

مگر یہ کیونکر ہوا؟ یہ صرف نئے کرنسی سسٹم کا کرشمہ ہے۔ روپیہ کے سو ٹکڑے کر کے پیسہ کی قدر کم کر دی گئی ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا ہے۔ کہ جو دوکاندار پہلے ایک پیسہ دیتا تھا اب تین پیسے دیتا ہے۔ بلکہ اب وہ پیسہ کو اس قدر حقیر گنتا ہے کہ دن بھر میں بیسیوں نئے پیسے دے دیتا ہے اور محسوس تک نہیں ہوتے۔ اس کا بدیہی نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے بھائیوں کی اکثریت جو بیروزگاری کی دوزخ میں قلق رہی تھی روزگار کی جنت میں بیٹھی لوٹنے لگی ہے۔ گویا ایک طرف وہ آسانی پیدا ہو گئی ہے۔ دوسری طرف اس سے وقت میں بھی کفایت ہوتی ہے کیونکہ اب ہمیں دکانداروں سے زیادہ لڑنا جھگڑنا نہیں پڑتا۔ دوکانداروں کا اب یہ حال ہے کہ ہماری صدا ابھی منہ میں ہی ہوتی ہے اور پیسہ کشکول میں آ گرتا ہے۔ کیسی قابل قدر تبدیلی ہے۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ میں سو دفعہ "مرحبا" کہوں۔ اور بھول جاؤں اور پھر سو مکمل کر دوں۔ تیسرا فائدہ جو حکومت کی نظروں سے اوجھل رہا یا ہمیں کہیئے کہ وہ نئے کرنسی سسٹم کا ایک بالواسطہ فائدہ ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے گداگر طبقہ میں روزگار کی تلاش میں جو تکالیف اور مشکلات تھیں وہ بہت حد تک حل ہو گئی ہیں۔ ہمارے حلقۂ احباب میں روزگاری کی سطح اب نوے فیصدی سے بھی متجاوز ہے جو کہ یقیناً بڑی حوصلہ افزا صورت ہے۔

بالآخر میں حاضرین سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ گورنمنٹ کے اس اقدام کو پیغام رحمت سے تعبیر کرتے ہوئے اس کے شکرگزار بنیں اور یقین رکھیں کہ اُن کا مستقبل قریب بہت روشن ہے۔ تقریر ختم کرنے سے پہلے میں آپ کے سامنے ایک سفارش رکھتا ہوں۔ ع

گر قبول افتد زہے قسمت

اور وہ یہ ہے کہ گورنمنٹ کی مکرر بالشّ سے درخواست کی جائے کہ وہ روپیہ کو ختم کر دے اور صرف اٹھنی اور پیسوں پر ہی اکتفا کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اٹھنی کو پچاس پیسوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ دوکاندار پیسہ کو اور بھی حقیر سمجھنے لگیں گے اور اس طرح ہمارا مزدور طبقہ سو فیصدی برسر روزگار ہو جائیگا۔ انشاءاللہ۔

میرے خیال میں مسٹر مخشو کی سفارش افراد کو تو فائدہ پہنچائے گی مگر جماعت کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ اس لئے میں ان کی سفارش کی پُرزور مخالفت کرتا ہوں۔ شکریہ!"

تقریر کے اختتام پر صاحب صدر نے ریمارکس دیئے:

"مسٹر کام چور صاحب قرار کی تقریر ایسی عالمانہ تھی۔ کہ اس کو سننے کے بعد ہماری عقلوں کے پردے کھل گئے ہیں۔ اس تقریر کے لازوال حقائق سے روگردانی کرنا اپنے آپ کو آگ میں جھونکنا ہے۔ خیراتی کی تقریر اس امر کو اور بھی زیادہ اہم کر دیتی ہے۔ کہ فریق ثالث کی رائے کو بھی پورے غور اور فکر کے ساتھ سننا اور پھر اس پر سوچنا چاہیئے تاکہ اس کے تمام پہلو من کل الوجوہ روشن اور واضح ہو جائیں۔

ب جناب عدم طمع صاحب تاتانچ قائد ''لبرل پارٹی'' مسئلہ زیر بحث پر روشنی ڈالیں گے۔''

اس وقت آپ کے سامنے جناب تاتانچ صاحب بول رہے ہیں:-

''حضرات! میں لبرل پارٹی کا نمائندہ ہوں۔ اس لئے طبعاً میرا نقطہ نظر ''لبرل'' ہوگا۔ آپ کو علم ہے کہ یہ ''پیشہ'' اختیار کرنے سے پہلے میں آپ لوگوں کا مالی مشیر تھا اور مختلف طریقوں سے آپ لوگوں کی مالی رہنمائی کیا کرتا تھا۔

ان تمام مشوروں کی بنیاد میرا وہ مطالعہ ہے جو میں نے انسانی نفسیات کا کیا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ان مشوروں کی روشنی میں آپ نے کس قدر ترقی کی ...... اب میں آپ کی ایسوسی ایشن کا بلکہ یوں کہیئے کہ ''اپنی'' ایسوسی ایشن کا باقاعدہ ممبر ہوں اور اس ایسوسی ایشن کے تیسرے جزو ترکیبی یعنی ''لبرل پارٹی'' کا صدر بھی ہوں۔ میرے مطالعہ کا ماحصل یہ ہے کہ جس قدر کسی چیز کی قدر کم ہو جاتی ہے اسی قدر انسان اس کو حقیر سمجھنے لگتا ہے۔ ''قدر'' معاشیات کی اصطلاح ہے اور اس کا مطلب ہے ''قوت خرید'' بالخصوص زر کی۔ چنانچہ اس بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ کرنسی کی موجودہ پالیسی ہماری ایسوسی ایشن کے لئے من حیث الجماعت فائدہ مند ہے۔ کیونکہ جس چیز کی قدر کم ہوتی ہے وہ ملکیت کسی اور کی ہے۔ دوسرے جس چیز کی طلب ہماری طرف سے ہے وہ وہی چیز ہے جس کی قدر کم ہو گئی۔ اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ اس چیز کے مالک اس کو حقیر سمجھ کر مانگنے والے کو بغیر کسی پس و پیش کے دے دیں گے۔ اور یہی ہم چاہتے ہیں۔

گو میں مانتا ہوں کہ اس کا اثر بعض افراد پر بڑا پڑا ہوگا مثلاً محترم کنگھو صاحب ہیں۔ وہ یقیناً بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ مگر جماعت کی خاطر انہیں اپنی تکلیف کو برداشت کرنا چاہیئے۔ جہاں تک مسٹر کنگھو اور مسٹر قرار کی سفارشات کا تعلق ہے میرے خیال میں اگر ان میں سے کوئی ایک بھی منظور ہو گئی۔ تو بالواسطہ ہماری موت ہے۔ کیونکہ یہ دونوں سفارشیں دو انتہائیں ہیں۔ اور انتہا ہر حالت میں خطرناک ہے۔ ہمیں میانہ روی اختیار کرنی چاہیئے۔ چنانچہ ہم خوش ہیں کہ گورنمنٹ نے خود ہی ہمارے لئے میانہ روی کی راہ ہموار کر دی ہے۔ جس کیلئے گورنمنٹ بلاشبہ شکرانہ کی مستحق ہے۔ مسٹر کنگھو اور مسٹر قرار کو علم ہونا چاہیئے کہ حکومت یہ تہیہ کر چکی ہے۔ کہ وہ ہمارے مشن —— آہ ہمارے مقدس مشن —— آہ ہمارے آباء کی مقدس امانت ''گداگری'' —— کو ختم کر کے دم لے گی۔ اس لئے امان اسی میں ہے۔ کہ خاموشی اختیار کی جائے۔ اگر تم روئے تو حکومت کو پتہ چل جائے گا کہ اس کا طریق زیادہ کارگر ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ وہ اُسے اور مضبوط اور موثر بنائے گی۔ اگر تم نے خوشی میں نعرے لگائے تو حکومت کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔ اور اپنے رویہ میں اصلاح اور ترمیم کر لے گی۔ نہیں میری

آپ سے پُرزور اپیل ہے کہ جس طرح گذر
رہی ہے غنیمت جانو ——— سکندرِ اعظم
کو یاد کرو۔ طمع اس کو لے ڈوبا تھا۔ پس تم
قناعت کرنا سیکھو۔ لالچ اور حرص سے
اپنا دامن بچاؤ۔ کیونکہ طمع وہ گھات ہے
جس میں تمہارے خون کا پیاسا دشمن تمہارا
انتظار کر رہا ہے۔ شکریہ!"

مجلس پر سناٹا چھا چکا ہے۔ حضرات معمول پر آچکے ہیں اور طبائع میں سکون کی لہر دوڑ چکی ہے۔ صاحبِ صدر آخری ریمارکس دینے کے لئے تیار ہوتے ہیں:-

"حضرات! آج کی بحث سے ہمیں بہت سے فائدے حاصل ہوئے ہیں۔ بالخصوص فارغ صاحب کی تقریر تو مجسم جذب و تاثیر تھی۔ ان کا ہمہ پیرایہ طرز تھا جو میرے دل کی گہرائیوں میں کھب کر رہ گیا۔ خدا جزائے خیر دے اس مردِ سلیم کو، مسئلہ کے تمام پہلوؤں کی کھال کو اس طرح ادھیڑ کر رکھ دیا کہ شک کی گنجائش باقی نہیں۔ حقائق اور معارف کا ایک دریا تھا۔ جو بہا جا رہا تھا۔ اور ہر عقلِ سلیم کو دعوتِ غور و فکر دے رہا تھا۔

آج کے مباحثہ کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ "پہلے بات کو تولو پھر بولو" — "پہلے دیکھو، اور پھر غوطہ لگاؤ"۔ حاضرین کے چہرے جناب فارغ صاحب کی رائے سے متفق نظر آرہے ہیں ـــ ٹن ٹن۔ ٹن ـــ ٹن۔ ٹن۔ ٹن ـــ ٹن۔ ٹن۔ ٹن ـــ ٹن رات کے دس بجتے ہیں۔ میٹنگ برخواست کی جاتی ہے۔ شکریہ۔

ھو (G.D.S.) پہنچا ہے۔ اس لئے تو دل سے شکریہ ادا کرکے رخصت چاہی — اس پہ ڈاکٹر صاحب مجھے دروازہ تک چھوڑ آئے ...... وقت تو گذر گیا۔ مگر اتفاقات کی یاد گدگداتی ہے ———

(بقیہ صفحہ)

تو اس نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کل کہہ رہے تھے کہ ایک لڑکا میرا مہمان آنے والا ہے۔ اس کے بعد اس نے بڑے خلوص اور احترام سے مجھے کھانا وغیرہ کھلایا۔ اچانک ڈاکٹر صاحب بھی آگئے۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ میں نے انہیں سارے حالات بتائے۔ مگر انہوں نے میرے دوست اور اس کے گھر والوں کے متعلق کچھ بھی نہ پوچھا۔ اُدھر چپڑاسی نے باتوں کا چکّر باندھنا شروع کر دیا کہ کس طرح تانگے میں سامنے سے گذر رہے تھے اور مجھے معلوم تھا کہ آپ کے مہمان آنے والے ہیں اس لئے میں نے ان سے دریافت کیا اور انہیں اندر لے آیا۔ ڈاکٹر صاحب ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے اور میرے ہی متعلق پوچھتے رہے ——— میں سوچنے لگا۔ کہ یہ اپنے رشتہ داروں کے متعلق کیوں کچھ ——— بھی دریافت نہیں کر رہے ——— اور جب کبھی میں اپنے دوست کا نام لے کر اس کے متعلق بتاتا۔ تو وہ خاموش رہ کر مسکرا دیتے ——— آخر کافی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے ان سے پوچھ ہی لیا۔ کہ آپ کو رفیق کا خط مل ہی گیا ہوگا۔ اس پر انہوں نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور ساری صورتِ حال اور اتفاق سے آگاہ کیا۔ فرمانے لگے اصل میں میں وہ ڈاکٹر نہیں ہوں جن کے متعلق آپ کو کہا گیا ——— آخرکار انہوں نے کہا کہ بات یوں ہے کہ میرے چپڑاسی نے آپ کے بتائے ڈاکٹر صاحب کے نام پر دھیان نہ دیا۔ بلکہ اس کے دماغ میں میرے ایک مہمان کا خیال رہا۔ جس کے متعلق میں نے اس کو بتایا تھا۔ یہ سنتے ہی مجھ پر سکتہ سا طاری ہوگیا اور سوچنے لگا کہ ڈاکٹر صاحب بھی کیا کہتے ہوں گے "نہ جان نہ پہچان میں تیرا مہمان" ——— ڈاکٹر صاحب نے میرے چہرے کے تاثرات پڑھ لئے اور فرمانے لگے یہ بھی آپ ہی کا گھر ہے اور آپ بھی میرے چھوٹے بھائی ہیں پھر G.D.S کے متعلق چند باتیں کیں۔ بالآخر میں نے ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی کہ چونکہ مجھے پہنچ کے

شیخ رشید تنویر

غزل

لب سے تو واہ واہ کیئے جا رہا ہوں میں
پر دل سے آہ آہ کیئے جا رہا ہوں میں

جتنے تراشتا ہے زمانہ صنم کدے
تیری ہی جلوہ گاہ کیئے جا رہا ہوں میں

دل میں صنم صنم ہے زباں پہ خدا خدا
دونوں سے یوں نباہ کیئے جا رہا ہوں میں

اپنا مقام ڈھونڈھ رہا ہوں جہان میں
تاروں کو گردِ راہ کیئے جا رہا ہوں میں

تعمیر کر رہا ہوں ترے حسن کا محل
دونوں جہان تباہ کیئے جا رہا ہوں میں

تنویر ایسا سبز قدم ہوں بہشت کو
خار و خس و گیاہ کیئے جا رہا ہوں میں

پروفیسر محمد شریف خالد

کوئل سے

اے طائرِ رنگیں نوا
شیریں ادا و دل ربا
ہیں تیرے نغمے جاں فزا
ہاں گائے جا تو گائے جا

سارا جہاں عشرت کدہ
لیکن تو کیوں ہے غمزدہ
یہ عالمِ جنت نشاں
کیوں بن گیا ماتم کدہ

اُف کس قدر دلسوز ہے
تیری نوا دل دوز ہے
یہ اضطراب و بے کلی
دل سوز ہے جاں سوز ہے

شاید کہ تم مہجور ہو
اپنے پیا سے دُور ہو
جور و جفا کے ہاتھ سے
نالاں ہو یا مجبُور ہو!

ہے گلشن و گلزار بھی
لالہ و لالہ زار بھی
ہیں کیف زا صبح و مسا
یہ سبزہ و کہسار بھی

ہاں یہ بہارِ جانفزا
بخشش یہ رومانی فضا
گر وہ نہیں تو کچھ نہیں
بے کیف ہیں صبح و مسا

طرب و نشاط انگیزیاں
آموں کے جھنڈ اور بستیاں
چھائی ہوئی ہیں بدلیاں
یہ رُت - یہ موسم یہ سماں

بس گائے جا شیریں بیاں
خالد کے دل کی ترجماں
یہ درد و غم کی داستاں
اے طائرِ نوحہ فغاں

قاضی محمد ظہور الدین صاحب اکمل

غزل

حریم شوق کیا کہیے یہی بہتر ہے چپ رہیے
بمجبوری مگر سرِ نہاں کہنا ہی پڑتا ہے
پیامِ وصل دیتا جا کہ اکثر شعلہ روؤں کو
نہیں کرتے ہوئے اک روز "ہاں" کہنا ہی پڑتا ہے
پلا ساقی مئے باقی کہ ہم سے تشنہ کاموں کو
یہ جملہ کھول کر اپنی زباں کہنا ہی پڑتا ہے
مسلمانوں کا حالِ زار لب تک آ نہیں سکتا
مگر سب کچھ بچشمِ خوں فشاں کہنا ہی پڑتا ہے
جمال و حسنِ روز افزوں کے چرچے بڑھتے جاتے ہیں
فدائی ہو رہا ہے اک جہاں کہنا ہی پڑتا ہے

پروفیسر نصیر احمد خاں ایم۔ایس سی

غزل

دبی زندگی کے غم میں دبی حسرتوں کے ساماں
کہیں گر رہی ہے بجلی کہیں اٹھ رہے ہیں طوفاں

میرا دل غریب سا ہے میرے دل کی لاج رکھنا
تری اک نظر کی قیمت میرے عمر بھر کے ارماں

کبھی تجھ سے ناامیدی کبھی تجھ سے آس اس کو
یہی دل بنا ہے کافر یہی دل ہوا مسلماں

تری بے حجابیوں سے دلِ طور پارہ پارہ
تگ و تازِ عشق مشکل ترا نازِ حسن آساں

مجھے لذتِ الم سے کیا آشنا انہی نے
دمِ دوستاں سلامت غمِ زندگی فراواں

کبھی لٹ گئے ہیں رہ میں کبھی رک گئے ہیں چل کر
کہیں رہزنوں سے ترساں کہیں رہبروں پہ حیراں

تو نصیر گھر گیا ہے غمِ زندگی میں یکسر
جا خدا ترا محافظ جا خدا ترا نگہباں

قندِ پارسی

در چنیں سوزِ نہاں آخر شبِ یلدا کنم
از وفورِ رنج گاہے نالہ ہا برپا کنم
اے بتِ کافر ادا در فرقت آخر تا کجا
من کہ ہر امروز را در یادِ تو فردا کنم
آں کمندِ زلفِ تو در بند میگیرد دلم
من نہ از خود ایں دلم بر حسنِ تو شیدا کنم
از دعائے نیم شب کز وصلِ تو گاہے کنم
در بارگاہ ذوالمنن یک محشرے برپا کنم
رازہائے عشقِ تاں اندر دلم می بُد نہاں
از گریہ و آہ و فغاں آں رازہا افشا کنم
چوں بودہ ام آخر نہ کم از غنچہ ہائے صبحدم
تا کے توانم اے صنم آں راز را اخفا کنم

من ز توصیفِ لبِ لعلینِ یارِ سیمتن!
خوشتر ز گوہرہائے یم لعل و گہر پیدا کنم

دو غزلیں

نصیر طاہر

یہ ہے تیری دلربائی یا جنونِ عاشقانہ
کہ سکوں سے چل رہا ہے میرے عشق کا فسانہ
میرے بحرِ عاشقی میں جو بپا تھا اک تلاطم
اسے مل گیا ہے اب تو تیرے پیار میں ٹھکانہ
میرے زخم بھر گئے ہیں مجھے چین مل گیا ہے
میرے مرض کی دوا تھی وہ ادائے قاتلانہ
مجھے زندگی ملی ہے تیری قربتوں کی خاطر
میری زندگی ہی کیا ہے! تیرے قرب کا زمانہ

یہ بہارِ حسنِ گیتی تری اک نگاہ سے قائم
مجھے دے گئی ہے سب کچھ وہ ادائے ساحرانہ

حکیم محمد صدیق صاحب

اٹھ ذرا بیدار ہو مسلم نکل آیا ہے دن
ہو چکا ہے نیّرِ اسلام پھر جلوہ فگن
آگیا ہے محفلِ ہستی میں پھر دورِ نشاط
ہو گئی بیدار پھر نجم و قمر کی انجمن
آسماں سے پھر ملائک کا لگا ہونے نزول
پھر شیاطیں کے لگے مٹنے ارادے پُرفتن
پھر حصولِ عظمتِ رفتہ کے ساماں ہو گئے
پھر سے اب ہونے لگا سارا جہاں اپنا وطن
پھر کمالاتِ محمدؐ کا لگا ہونے ظہور
آ گئے اسلام کی پھر نشاۃِ ثانی کے دن

کب تلک سنتا رہے گا سازِ مغرب کی صدا
آ ذرا اسلام کا بھی جانفزا پیغام سن

خلیق رامپوری

صورتِ زخم کھلے ہیں گل و لالہ اب کے
حال پوچھے گی صبا آ کے ہمارا اب کے

سو گئے آندھیاں ذروں سے اٹھانے والے
رہ گئے چند بگولے سرِ صحرا اب کے

آدمی تھا کوئی ڈھلتا ہوا سورج تو نہ تھا
کر گیا جاتے ہوئے گھر میں اندھیرا اب کے

روز اک نقش بناتا ہوں مٹا دیتا ہوں
سوچتا ہوں کہ مرا شغل بھی ہے کیا اب کے

کیا یونہی چھایا رہیگا افقِ دل پہ غبار
کیا نہ ہوگا مری دنیا میں اُجالا اب کے

اک فوارۂ صد رنگ ہے وہ پیکرِ ناز
ہم بھی دیکھیں گے سرِ بام جو آیا اب کے

آؤ اس یارِ وفا کیش سے مل آئیں خلیل
ورنہ سنتے ہیں کہ چڑھ جائیگا دریا اب کے

لطف الرحمٰن محمود

مسرور کر دیا کبھی رنجور کر دیا
اپنے قریب لا کے کبھی دور کر دیا

اے چشمِ یار بیخودی کا ماجرا نہ پوچھ
اک موجِ مے کے رقص نے مخمور کر دیا

یہ بھی کرم ہے آپ کے حسنِ نگاہ کا
مجھ کو حریمِ ناز میں مشہور کر دیا

پی کر شرابِ حسن تم مدہوش ہو گئے
مجھ کو شرابِ عشق نے مخمور کر دیا

اچھا ہوا کہ مل گئی اک مستقل حیات
شکر خدا کہ دار نے منصور کر دیا

یہ بھی ہوا کہ تیرے تصور نے بارہا
مجھ کو مری نگاہ سے مستور کر دیا

خونِ جگر سے آج پھر لکھی ہے اک غزل
محمود ان کی یاد نے مجبور کر دیا

مولانا مصلح الدین احمد راجگیری مرحوم

حسن تمہارا گلشن گلشن — عشق ہمارا تن من تن من
عرصۂ ہستی کوئے ملامت — راحتِ دنیا راہزن راہزن
عہدِ جوانی ایک فسانہ — دل کی امنگیں مدفن مدفن
رشتۂ الفت پیچک پیچاں — گیسوئے قسمت الجھن الجھن

وعدۂ جاناں دلبر و شیریں — نالۂ فرقت کوہ کن کوہ کن
قبلۂ مجنوں عارضِ تاباں — کعبۂ عاشق چتون چتون
حیف یہ آنکھیں دید کی پیاسی — اُف وہ نظارے چلمن چلمن

کس کو سنائیں غم کی کہانی
اپنے پرائے دشمن دشمن

وہ نہیں رسوا ایک اکیلے — ہم بھی ہیں رسوا برزن برزن
دل میں ابھی تک یاد ہے اُن کی — جن سے ہے اپنی اَن بن اَن بن
یہ نہ خبر تھی اے غمِ ہجراں — ہم بھی پھریں گے بَن بَن بَن بَن

کس کی نگاہ تھی جس نے اے مصلح
پھونک دیا ہے خرمن خرمن